تصوف کے آداب و اشغال
اور
اُن کا فلسفہ
اردو ترجمہ
القول الجمیل
حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ
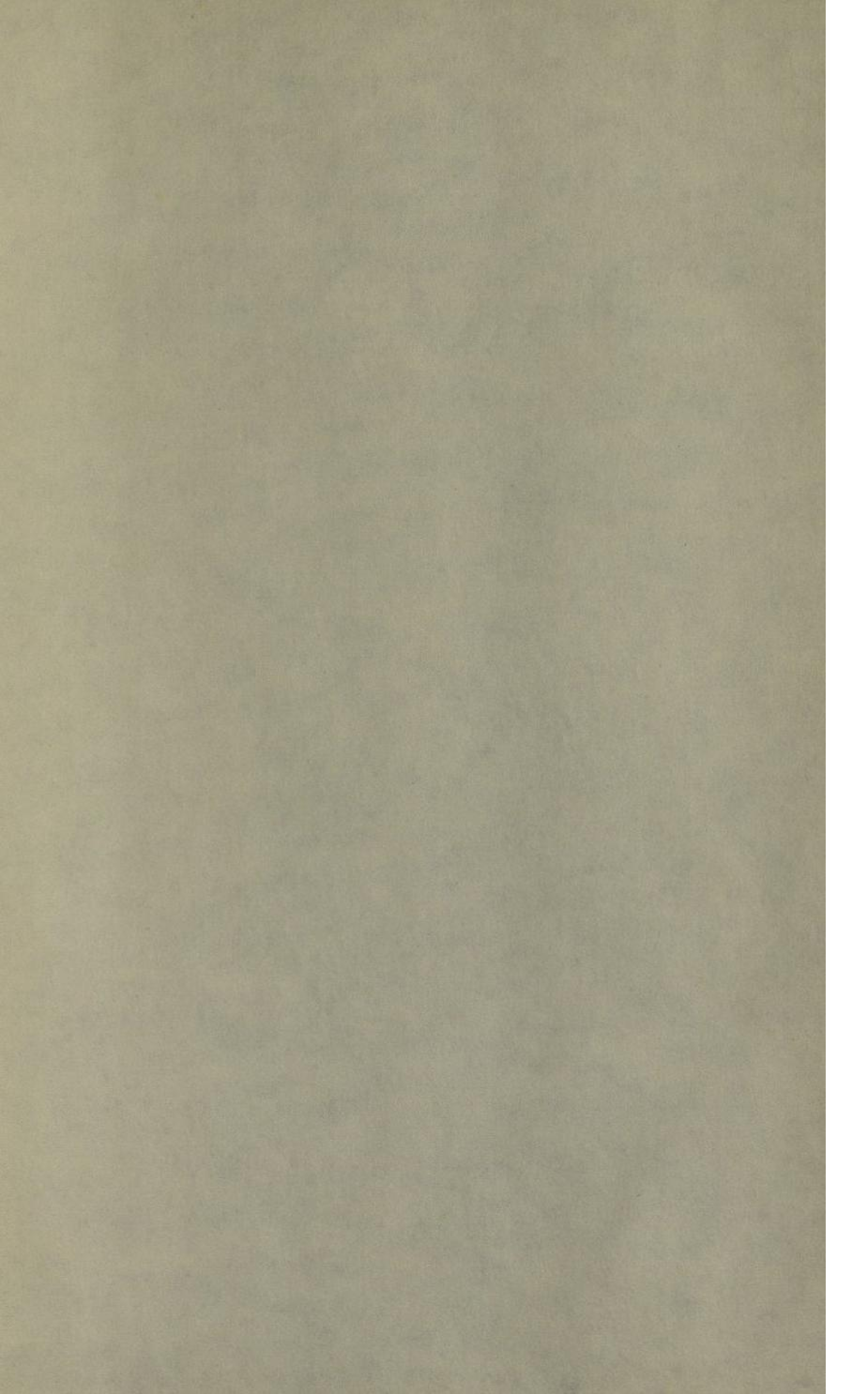
تصوف کے آداب واشغال اور ان کا فلسفہ

اردو ترجمہ

القول الجمیل

فی

بیان سواء السبیل

مصنّفہ : حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی

محمد سرور

جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

ایچ۔ وائی پرنٹرز۔ ۲۰/۱۰ ریٹی گن روڈ، لاہور

کلماتِ طیّبات

امام الائمہ حضرت امام ولی اللہ بن عبد الرحیم (رحمہما اللہ تعالےٰ بالطافہ العمیمہ) جس طرح تفسیر، فقہ اور حدیث کے امام ہیں، اسی طرح تصوف اور سلوک کے بھی امام ہیں۔ آپ انسانیت کے متعلق جس قدر علوم و معارف تلقین فرماتے ہیں، ان کو انسان کے لطائفِ ثلاثہ یعنی عقل (جس کا تعلق دماغ کے ساتھ ہے)، ارادہ (جس کا تعلق دل کے ساتھ ہے) اور تدبیرِ بدن (جس کا تعلق جگر کے ساتھ ہے) کے مطابق تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہر ایک انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تینوں قوتوں کو

عام انسانیت کے اصول پر عمل کرے۔ خداوند تعالیٰ نے نوعِ انسان کا جو نمونہ قائم کیا ہے، اس کے قریب پہنچنا ہر ایک انسان کا طبعی فرض ہے۔ اس سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ پس جو انسان اس نمونے کے جتنا قریب ہو گا، وہ اتنا ہی اچھا ہو گا۔ اور جو انسان اس نمونے سے جتنا دور ہو گا، اتنا ہی بُرا سمجھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حکمتِ ولی اللّٰہی میں تمدن بھی انسانیت کا لازم جزو قرار پایا ہے۔ اور موت پر انسانیت کا خاتمہ نہیں مانا جاتا، بلکہ اس کے بعد بھی اس کے لطائف کی تکمیل کا سامان ملتا رہتا ہے۔

ان مسائل کو بطور اصولِ موضوعہ تسلیم کر لیا جائے تو حکمت پسند دماغوں کو بحث اور فکر کے لیے علیحدہ موقعے بہم پہنچائے جائیں گے اور ان اصول کو تسلیم کرنے والے اگر اپنی نفسی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیں تو اسے سلوک کہا جا سکتا ہے۔

حضرت امام ولی اللہؒ نے سلوک پر چند کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ اذکار اور آداب جو ایک سالک کو سب سے پہلے کرنے چاہئیں "القول الجمیل" میں ذکر فرماتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ دماغ کو سلوک کا منتہی یعنی بنی نوعِ انسانی کے موطن حظیرۃ القدس سے اتصال سمجھانے کے لیے آپ نے "سطعات" تحریر فرمائی ہے۔

انسان کی اندرونی نفسی قوتوں یعنی عقل، ارادہ اور تدبیرِ نفس پر سلوک کا کیا اثر پڑتا ہے اور ایک قوت دوسری قوت سے کس طرح پھوٹ کر نکلتی ہے، اس کا بیان آپ نے "الطاف القدس" میں کیا ہے۔ راہِ سلوک کے جو بڑے سالک گزرے ہیں، اُن میں سے ابتدائی دور میں حضرت جنید بغدادی اور بایزید بسطامی (رحمہما اللہ تعالیٰ) ہیں اور آخری دور میں حضرت شیخ عبد القادر

جیلانی، حضرت شیخ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ بہاؤ الدین نقشبند، (رحمہم اللہ تعالیٰ) بہت بڑے بزرگ ہیں۔ انہوں نے سلوک کس طرح مرتب کیا اور ان کی صحبت سے کامل کس طرح پیدا ہوئے، یہ تاریخِ حکمت کا ایک مستقل باب ہے، جسے امام الائمہ حضرت امام ولی اللہ نے "ہمعات" میں ضبط فرمایا ہے۔ اسے تصوف کا فلسفۂ تاریخ سمجھنا چاہیئے۔

آگے انسانیت اس فکر کو عقلی درجے پر کس طرح قبول کرے گی؟ پرانے یونانی اور ہندی حکماء انسانیت کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے؟ وہ اپنے خیالات کو انسان کے عام معارف کے ساتھ کس حد تک موافق بنا سکے، اور ایک حکیم ان کو تسلیم کر کے اپنے سلوک کو کس طرح معقول طور پر پیش کرتا ہے، اس کے لیے آپ نے "لمحات" لکھی۔ آپ کے پوتے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے ان رسالوں کی تمہید "العبقات" کے نام سے لکھی۔

اگر ان پانچوں رسالوں کو تھوڑی سی محنت کر کے غور سے پڑھ لیا جائے تو امام ولی اللہ کا سکھایا ہوا طریقِ سلوک اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ حکمتِ ولی اللٰہی میں یہ رسالے ابتدائی قاعدوں کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد امام ولی اللہ کی حکمت کی تعلیم شروع کی جاتی ہے۔

۱۰ / اپریل ۱۹۴۴ء ہندی

عبید اللہ السندھی

مدرسہ قاسم العلوم، لاہور۔

عرضِ مترجم

زیرِ نظر کتاب "القول الجمیل" میں تصوف و سلوک کے اوراد و وظائف، صوفیاء کے آداب و اشغال اور دفعِ امراض اور مصائب کے تعویذات کا ذکر ہے اور چونکہ یہ موضوع عام دلچسپی کا ہے اور اب تک ان چیزوں کی طرف عام طور پر مسلمانوں کی توجہ رہی ہے اور حالات کی سنگینی کا ان کے سوا

کوئی مداوا نہ تھا - اور پھر بات یہ ہے کہ اس کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے میں بھی زیادہ وقت نہیں ہوتی - اس لیئے شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ تصنیف ان کی تصوف وسلوک کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول رہی ہے -

ابھی حال میں لاہور سے "القول الجمیل" کا عربی متن شائع ہوا ہے - یہ کتاب اسی عربی متن کا اردو ترجمہ ہے - اس سلسلہ میں خوش قسمتی سے "شفاء العلیل" کے نام سے "القول الجمیل" کا اردو ترجمہ معہ عربی متن کے مجھے مل گیا - یہ ترجمہ آج سے سو برس پہلے سنہ ۱۲۶۰ھ میں ایک بزرگ مولانا خرم علی نے کیا تھا اور سنہ ۱۳۰۱ھ میں دہلی میں یہ طبع ہوا - میں نے اس ترجمہ میں "شفاء العلیل" سے بھی مدد لی ہے - خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا خرم علی مرحوم کی روح کو اس خدمتِ علمی کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے -

اس ترجمہ میں میری برابر یہ کوشش رہی ہے کہ زبان آسان ہو اور عربی عبارت کا مفہوم پوری طرح اردو میں ادا ہو جائے تاکہ اردو جاننے والوں کے لیے اس کتاب کے مطالب کا سمجھنا مشکل نہ رہے -

"القول الجمیل" کے اردو ترجمہ کی اشاعت کا مقصد جو اس وقت مترجم کے پیشِ نظر ہے، وہ یہ ہے کہ آج جبکہ ہر طرف مسلمانوں میں انفرادی اور جماعتی زندگی کی تشکیلِ نو کے نقشے بن رہے ہیں - اس زمانے میں ہم اپنی قوم کی ذہنی میراث کے اس قابلِ قدر اثاثے یعنی تصوف و سلوک سے ناواقف نہ رہیں - شاید اس اثاثۂ علمی و فکری میں ہمیں ایسی چیزیں مل جائیں جو مستقبل کی تعمیر میں ہمارے لیے باقیاتِ صالحات بنیں اور

ان کی مدد سے ہم اس قابل ہوں کہ حیاتِ قومی کی عمارت کو سطحِ زمین کی بجائے نیچے سے مستحکم بنیادوں پر کھڑی کر سکیں۔

نومبر ۱۹۴۵ء

محمد سرور
جامعہ نگر دہلی

فہرست مضامین

پیش لفظ

انسانی زندگی کی صحت کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کے باطنی اور خارجی دونوں پہلوؤں میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی ہو۔ ظاہر ہے انسان اکیلا تو اس دنیا میں زندگی بسر کرنے سے رہا، وہ لامحالہ محتاج ہوتا ہے معاشرہ کا۔ اب معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ اپنے افراد کے لیے صحت مند اور صالح زندگی چاہتا ہے تو وہ ان کی باطنی اور خارجی زندگی کا باہمی توازن نہ بگڑنے دے۔ کیونکہ جہاں یہ توازن بگڑا، افراد یا تو مادی لذتوں اور وقتی اغراض کے پیچھے زندگی کی باطنی قدروں سے جو افراد کی زندگی کے استحکام کے لیے ضروری ہوتی ہیں، منہ موڑ لیتے ہیں — اور یا وہ خارجی زندگی اور اس کے مادی ماحول سے بے پرواہو کر من کی دنیا میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں

کہ انہیں اپنے گردوپیش تک کی ہوش نہیں رہتی۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ بھول جاتے ہیں کہ اگر باطنی زندگی خارج میں جو مادی ماحول ہوتا ہے اس کو متاثر کرتی ہے تو اسی طرح مادی ماحول کا بھی زندگی کی باطنی صلاحیتوں پر اثر پڑتا ہے۔ اب اگر خارجی زندگی میں جمود، بے حسی اور موت کا عمل دخل ہوگا تو کیسے ممکن ہے کہ باطنی زندگی صحت مند رہ سکے۔

دنیا میں جتنی بھی قابلِ ذکر تہذیبیں گزر چکی ہیں، ان میں سے کم و بیش ہر ایک نے اپنے زمانے میں ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے باطنی تقاضوں اور خارجی ضرورتوں میں جہاں تک ہو سکے ہم آہنگی پیدا کرے۔ چنانچہ جب تک یہ تہذیبیں اس میں کامیاب رہ سکیں، ان میں زندگی کی نمو اور ترقی کے صالح عناصر بھی موجود رہے اور ان کے معاشرہ میں بھی ایک نہ ایک حد تک نظم رہا۔ لیکن جب وہ وقت آیا کہ کسی وجہ سے کوئی تہذیب اس ہم آہنگی کو قائم نہ رکھ سکی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے معاشرہ کا شیرازہ بکھرا۔ افراد کی نظروں میں جماعتی ضابطوں کی اہمیت کم ہونی شروع ہو گئی۔ اور فرد اور جماعت میں جو توازن تھا وہ جاتا رہا۔ چنانچہ اس بدنظمی میں فرد اپنے آپ کو معاشی، سیاسی اور روحانی اعتبار سے غیر محفوظ محسوس کرنے لگا اور وہ مجبور ہو گیا کہ وہی جماعت جو پہلے اس کے لیے جائے امن و قرار تھی، اب وہ اس کی دراز دستیوں سے بچنے کی تدبیر کرے۔ اس حالت میں فرد کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں یا تو وہ مادی لذتوں میں اپنے آپ کو اور اپنے غموں کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے اور یا اس کا رُخ خارج سے ہٹ کر بالکل باطن کی طرف ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ اس عالم میں پہنچ جاتا ہے جہاں سے خود اس کو اپنی

خبر نہیں آتی، بے شک اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ان دو صورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن عملاً معاشرہ کے لیے ان دونوں کے نتائج ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ الغرض جب کوئی تہذیب اس منزل میں پہنچتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ گویا اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے۔

یہاں ہمیں دنیا کی اور تہذیبوں سے بحث نہیں۔ ہمارا تعلق چونکہ اسلامی تہذیب سے ہے اور یہی اس وقت ہمارا موضوعِ بحث بھی ہے، اس لیے ہم اسی کا ذکر کرتے ہیں۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اپنے ابتدائی دور میں اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے زندگی کے باطنی اور خارجی جو دو پہلو ہیں، ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس نے مذہب کا جو تصور پیش کیا، وہ جامع تھا انسان کی پوری زندگی اور اس کے تمام شعبوں پر، اس دنیا کی مادی زندگی پر بھی اور اس مادی زندگی کے ماوراء انسان کی جو داخلی زندگی ہے، اس پر بھی یعنی اس کا نصب العین "حَسَنَةً فِي الدُّنْيَا" بھی تھا اور اس کے پیشِ نظر "حَسَنَةً فِي الْآخِرَةِ" بھی تھا۔ اسلامی تہذیب نے "حَسَنَةً فِي الدُّنْيَا" کے حصول کے لیے ایک اجتماعی نظام پیش کیا، جس کے دو اساس تھے ایک معاشی اور دوسرا سیاسی۔ اسلامی تہذیب کا معاشی اساس "وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ" یعنی دولت مندوں کے مال میں غریبوں اور محتاجوں کا حق ہے۔ اور وہ قانوناً مجبور ہیں کہ اپنے بھائیوں کی کفالت کریں۔ اور "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" یعنی حکومت افراد کے مشورے سے ہو۔ یہ تھا اسلامی تہذیب کا سیاسی اساس۔ اب رہا "حَسَنَةً فِي الْآخِرَةِ" اس کے لیے اسلامی

تہذیب میں انسان کی باطنی زندگی کی صحیح نشو و نما کا بھی پورا پورا انتظام کیا گیا۔ انسان کی باطنی زندگی اس کی نفسی زندگی ہے اور انسانی نفس عبارت ہے اس کے جذبات سے، اس کی عقل اور اس کے عزم و ارادے سے۔ جذبات کی اصلاح و تزکیہ کے لیے اسلامی تہذیب میں خدا اور اس کی مخلوق سے محبت کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ عقل کی ترقی کے لیے تدبّر اور تفکّر کا حکم دیا گیا اور عزم و ارادہ کی تقویت کے لیے ایمان اور اعمالِ خیر پر زور دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ باطنی زندگی کے یہ اعمال و اخلاق محض فرد کی ذاتی زندگی تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ چنانچہ اور تو اور عبادت جیسی چیز جو بالکل شخصی اور داخلی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا اصلی مقصد فرد اور اس کے خالق کے درمیان قلبی تعلق پیدا کرنا ہوتا ہے، اسلامی تہذیب نے اس کو بھی جماعتی شکل دینے کی کوشش کی۔ اس سے دراصل اس کا مقصود یہ تھا کہ پہلی تہذیبوں کی طرح اسلامی تہذیب میں بھی کہیں مذہب محض شخصی اور باطنی چیز نہ بن جائے اور ایک صالح زندگی کے لیے خارجی اور داخلی زندگی میں جس ہم آہنگی کی ضرورت ہے مسلمانوں کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل نہ ہونے پائے۔

یہ تھا اسلامی تہذیب میں خارجی اور باطنی زندگی میں ہم آہنگی کا وہ نظام جس پر خلافتِ راشدہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ گو خلافتِ راشدہ کا زمانہ بہت مختصر رہا۔ لیکن اس کے بعد بھی اسلامی تہذیب ایک عرصۂ دراز تک اپنی اس خصوصیت کو کسی نہ کسی حد تک قائم رکھنے میں کامیاب رہی ہے۔ بے شک اس ضمن میں یہ ضرور ہوا کہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا گیا، اور نئے نئے حالات پیش آتے گئے، اسلامی تہذیب کی اس خصوصیت کو

محفوظ رکھنے کی بھی مختلف صورتیں بروئے کار آتی رہیں۔ مثلاً خلافتِ راشدہ میں ملّی زندگی کا ایک جامع اور ہمہ گیر مرکزی نظام تھا، جو مسلمانوں کی زندگی کے معاشی، سیاسی، روحانی، علمی اور اخلاقی تمام شعبوں کا کفیل تھا چنانچہ جو خلیفہ ہوتا، وہ صدرِ حکومت بھی ہوتا، وہی مقدمات کے فیصلے کرتا، فتوے بھی وہی دیتا۔ اخلاق و اعمال کی نگرانی بھی اسی کے ذمہ تھی اور مسجد میں نماز بھی وہی پڑھاتا تھا اور امیر حج بھی وہی بنتا۔ غرضیکہ ملّت کی وحدت اپنی مکمل ترین شکل میں خلیفہ کے ذات میں مجسّم تھی۔ لیکن یہ صورت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی اور ایسے خلفاء کا برابر ملتے رہنا جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی طرح جامع صفات ہوں، بڑا مشکل تھا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد اموی دور آیا تو ملّی زندگی کی یہ وحدت، دو حصوں میں بٹ گئی۔ جو حکمران تھے، انہوں نے نظم و نسق سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اہلِ علم اور اربابِ صلاح و تقویٰ طبقے ملت کی انفرادی اور جماعتی زندگی کی علمی اور روحانی و اخلاقی نشوونما میں لگ گئے۔ دوسرے لفظوں میں جو کام پہلے ایک ہی مرکزی نظام کے تحت ہوتے تھے، اب ان کاموں کو دو جماعتیں کرنے لگیں۔ ہمارے نزدیک اربابِ حکومت اور اہلِ علم کی ان دو جماعتوں میں اس زمانے میں اتنا بُعد نہ تھا جتنا کہ آج تاریخ کو سطحی نظر سے دیکھنے والے بتاتے ہیں۔ بے شک خلافتِ راشدہ میں مدینہ منورہ مسلمانوں کا سیاسی مرکز بھی تھا اور ان کا علمی مرکز بھی — اور جب بنی اُمیہ آئے تو سیاسی مرکز دمشق میں منتقل ہو گیا۔ اور مدینہ منورہ بدستور علمی مرکز رہا۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ سیاسی اور علمی مرکزوں کی اس جبری علیحدگی سے مسلمانوں کے اہلِ سیاست اور اہلِ علم میں اتصال اور تعاون بھی ختم ہو گیا، ٹھیک نہیں۔

اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ اموی خلفاء تو ایک طرف رہے، ان کے بہت بعد عباسیوں کے زمانے تک ہر خلیفہ اپنے پایۂ تخت سے حج کے موقعہ پر مکہ و مدینہ پہنچتا اور اسلام کے ان علمی سرچشموں سے متعارف ہونے کی کوشش کرتا۔ بلکہ ان خلفاء میں سے عبدالملک بن مروان ایسے بھی خلفاء گزرے ہیں، جنہوں نے مدینہ کے دارالعلم میں تعلیم حاصل کی تھی۔ چنانچہ اس کے متعلق کہا جاتا اگر وہ خلیفہ نہ ہوتا، تو اپنے وقت کا بہت بڑا مجتہد ہوتا اور یہی بات خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اور خلیفہ منصور عباسی کے متعلق بھی کہی گئی ہے اور ان دونوں کو بھی مدینہ کے ممتاز اہلِ علم میں سے شمار کیا گیا ہے۔

ہارون الرشید اور مامون الرشید تک یعنی جب تک کہ اسلامی خلافت پر عربوں کی جمعیتِ قومی کا تسلّط رہا، ہم دیکھتے ہیں کہ حکمرانوں اور علمی طبقوں میں کسی نہ کسی حد تک تعاون پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ سے خارجی و باطنی زندگی میں وہ ہم آہنگی جس کے متعلق ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ اسلامی تہذیب کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت تھی، مسلمانوں میں کم و بیش قائم رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ایک اور دور آتا ہے۔ اس دور میں ایک طرف اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں پر عیسائیوں کے زبردست حملے شروع ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف ایرانی اور ترک نیم آزاد حکومتیں بناتے ہیں اور ان کی آپس میں پیہم لڑائیاں ہوتی ہیں اور اس طرح اسلام کے سیاسی نظام کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں نہیں رکتا۔ اسی زمانے میں مسلمانوں میں یونانی علوم، ایرانی ادب اور ہندی افکار کی اشاعت ہوتی ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی ذہن

میں ایک بحرانی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور بظاہر یوں نظر آنے لگتا ہے کہ یہ سیاسی انتشار اور فکری سیلاب اسلامی تہذیب کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔ پھر مسلمان ابھی ان مصائب سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ شام و فلسطین اور مصر پر یورپ اپنی پوری جمعیت کے ساتھ صلیبی حملے شروع کر دیتا ہے اور ایک صدی کی مسلسل اور جان ہار کوششوں کے بعد مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات ملی ہی تھی کہ تاتاری وسطِ ایشیا سے نکلتے ہیں اور اسلامی تہذیب کے مرکزوں کو جلا کر بالکل خاک سیاہ کر دیتے ہیں۔

کچھ بعید نہ تھا کہ ان پے در پے بیرونی حملوں اور خود مسلمانوں کے داخلی خلفشار اور ان کے ذہنی بحران سے اسلامی تہذیب جاں بر نہ ہو سکتی۔ لیکن اسے اسلامی تہذیب کا ایک اعجاز سمجھیے کہ اس نے صدیوں تک ان طوفانوں کا مقابلہ کیا اور وہ وحشت اور بربریت کے اس تاریک دور میں علم و اخلاق کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھنے میں کامیاب ہو سکی لیکن اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ کیسے ہوا؟ اور اسلامی تہذیب کی وہ کون سی داخلی صلاحیتیں تھیں، جن کی وجہ سے وہ ان تباہ کاریوں کے باوجود کسی نہ کسی حد تک اپنے وجود کو باقی رکھ سکی؟۔ ہمارے نزدیک اس طویل دور میں اسلامی تہذیب کی بھلی بری جو بھی حفاظت ہوئی، اس میں سب سے زیادہ حصہ صوفیائے کرام کا ہے۔ یہاں ہمیں ان صوفیاء سے بحث نہیں، جو علم سے بے بہرہ اور عمل سے عاری تھے، بلکہ ہماری مراد ان صوفیاء سے ہے جو دین سے بھی آگاہ تھے، حکمت و فلسفہ کی صداقتوں اور اس کی خام خیالیوں کو بھی سمجھتے تھے اور اعمال و اخلاق اور اجتماعی زندگی کے ضابطوں اور قواعد کی ضرورت سے بھی ناآشنا نہ تھے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی جمعیت پراگندہ ہو گئی۔ ایک ملّی وحدتِ سیاسی کے بجائے طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا اور اس کے بعد مسلمانوں میں اور جھگڑے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ افراد کے لیے زندگی گزارنا محال ہو گیا تو صوفیا نے اس انتشار سے عاجز آ کر جس پر قابو پانا اُس وقت کسی کے لیے ممکن نہ تھا، یہی غنیمت سمجھا کہ وہ کم سے کم اپنے زاویوں اور خانقاہوں ہی میں اسلامی تہذیب کو بیرونی زندگی کی آلائشوں سے پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح یہ زاویے اور خانقاہیں مدرسے اور تربیت گاہیں بن گئیں۔ جہاں عقیدت مند جمع ہوتے، تعلیم و تربیت پاتے اور پھر وہ تصوف کے اس سلسلے کو اور آگے بڑھاتے۔ اس زمانے میں جب کہ اسلامی ملکوں میں کوئی پائدار سیاسی نظام نہ تھا۔ فوجی طاقت بالکل جاہل طبقوں کے ہاتھ میں تھی۔ عوام میں کسی قسم کا کوئی سیاسی شعور نہ تھا، اور ہر وقت بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں کا خطرہ لوگوں کو پریشان رکھتا تھا، ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر یہ صوفیا اسلامی تہذیب کی شمع کو ان جھگڑوں سے بچا کر جو ہر طرف تباہی لا رہے تھے، خانقاہوں میں جلتے نہ رکھتے تو معلوم نہیں اسلامی تہذیب کا کیا حشر ہوتا۔

تصوف و سلوک کا بیشتر ادب اور اس کی طریقت کے سلسلے زیادہ تر اسی دورِ خلفشار میں پیدا ہوئے۔ یقینی تھا کہ زندگی کی مشکلات اور بے اطمینانیوں کا اُن پر ردِ عمل ہوتا، اور وہ ہوا۔ لیکن اسلامی تصوف و سلوک میں ایک بات بڑی نمایاں ہے، جو دوسری قوموں کے تصوف میں مشکل سے ملے گی۔ اسلام نے جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، باطنی زندگی کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی کی تعمیر و ترقی پر بھی بڑا زور دیا ہے۔ اور اسی نے رہبانیت کی، جو خانقہی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے، سخت مذمت کی ہے مطلب صورت یہ ہے کہ صوفیا کے نزدیک علم

دین کی تحصیل تصوف کی پہلی منزل تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ پر

عمل [illegible] سب سے اہم فریضہ۔ اب ہوا یہ کہ ایک طرف تو زندگی کا

ناسازگار ماحول اور آئے دن کی مصیبتیں تصوف کا ذوق رکھنے والوں کو دنیا

کے علائق سے بیزار کرتیں اور وہ خانقاہوں میں پناہ لیتے۔ اور دوسری طرف

علمِ دین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کی مثالیں تھیں، جو

رہبانیت کو خلافِ اسلام بتاتی تھیں۔ الغرض اس عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ یہ

نکلا کہ اگر صوفیا کی ایک بڑی تعداد راہِ اعتدال سے ہٹ گئی اور انہوں نے خارجی

زندگی کو چھوڑ کر محض باطنی زندگی ہی کو اپنا مقصود و منتہا بنا لیا، تو ان میں ایک

کافی تعداد ایسے بزرگوں کی بھی موجود رہی جو تصوف کو شریعت کے تابع کرنے اور

صوفی کو جماعتی ضابطوں کا پابند بنانے پر زور دیتی رہی۔ یہ بزرگ تصوف کے

اشغال و اذکار کی تلقین فرماتے۔ طالب علموں کو دینی علوم کا درس دیتے۔

ارادت مندوں کے نفوس کا تزکیہ کرتے۔ پھر بادشاہوں کو نیک مشورے بھی

دیتے۔ اور انہیں خلقِ خدا کی بہبود اور مظلوموں کی داد رسی کی طرف متوجہ

بھی کرتے۔

قصہ مختصر۔ اسلامی تہذیب کے دورِ اول میں خلافتِ راشدہ کا نظامِ

حکومت ملت کی خارجی اور باطنی زندگی کی ہم آہنگی کا ایک کامل نمونہ تھا۔ اس

کے بعد جو دور آیا، اُس میں مسلمان حکمرانوں اور اُن کے علما نے مل کر اس ہم آہنگی

کو جہاں تک کہ ان کی بساط تھی اور جس حد تک حالات نے اجازت دی،

نباہا۔ اس کے بعد جب تیسرا دور آیا اور فتنہ و فساد بہت زیادہ بڑھ گیا تو

اسلامی تہذیب کے تحفظ کا فرض سب سے زیادہ صوفیا نے، ان کے بعد علما نے

اور آخری درجے میں مسلمان حکمرانوں نے سرانجام دیا۔

ہم اور اسلامی ملکوں کے بارے میں نہیں کہتے لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہاں اسلامی تہذیب کی نمائندگی یہی عناصر کرتے رہے ہیں اور اسی ترتیب کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ علمائے اسلام سلطنت کے قانون کے محافظ ہوتے۔ بادشاہ امن وامان قائم کرتے۔ اور صوفیا اسلامی تہذیب جن روحانی بنیادوں پر قائم تھی، اُن سے ہر خاص وعام کو متعارف کراتے تھے۔ اسی وجہ سے عوام انہیں کو زیادہ مانتے۔ اور اُمرا اور بادشاہ بھی ان کی نصیحتوں پر کان دھرتے تھے۔ التمش اور خواجہ بختیار کاکی، علاؤ الدین اور خواجہ نظام الدین اولیا، فیروز تغلق اور خواجہ چراغ دہلی اور پھر خواجہ باقی باللہ اور اکبری دربار کے ممتاز امرا اور ان کے بعد حضرت مجدد الفِ ثانی اور جہانگیر کے امرائے سلطنت الغرض اورنگ زیب کے زمانے تک سلطنت اور مسندِ تصوف میں جو تعلق رہا ہے۔ اور مسلمان فاتحوں کی فوج کشیوں کے صوفیائے کرام جس طرح نعم البدل بنتے رہے ہیں۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے کون شخص ہے جس کو اس حقیقت کے اعتراف کرنے میں تامل ہوگا کہ اسلامی تاریخ کے آخری ادوار میں صوفیا ہی نے اسلامی تہذیب کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔

بہر حال یہ تو سرگذشت ہوئی کھوئے ہوؤں کی۔ اب تو ہماری حالت یہ ہے کہ مسلمان سلاطین کا اس وقت کوئی مرثیہ خواں تک بھی نہیں رہا ہے۔ ہاں خدا کے فضل سے علما کی آج کمی نہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر بدقسمتی سے عہدِ حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں۔ باقی رہے صوفیا تو بغیر کسی استثنٰی کے آج ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت مجدد کی لحد سے علامہ اقبال کو یہ جو صدا آئی تھی کہ اہل نظر کشور پنجاب (یا اسے کُل ہند کہہ لیجیے) سے بیزار ہیں اور ایسا سلسلہ فقر بند ہوگیا ہے۔ بالکل ٹھیک تھی۔ بے شک جو کلہ فقر کبھی ولولہ حق کے لیے

ہوتا تھا، اب وہ علامہ اقبال کے الفاظ میں "نشۂ خدمتِ سرکار سے طرۂ دستار میں بدل چکا ہے"۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تصوف آج عبودیتِ غیر اللہ کا مظہر بن گیا ہے۔ اور صوفیا نے اپنے خدا پرست اور تارکِ دنیا بزرگوں کی مسندوں کو جاہ پرستی اور جلبِ مال و زر کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ اس لیے آج پیری و مریدی کی دعوت دینا یقیناً مسلمانوں سے دشمنی کرنا ہوگا۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی یہ کتاب جس کا ترجمہ اُردو میں پیش کیا جا رہا ہے تصوف پر ہے اور اس میں پیری مریدی کا بھی ذکر ہے، لیکن مترجم نے پیری مریدی کی تائید یا اس فکر کی اشاعت کے لیے اس کتاب کا ترجمہ نہیں کیا۔ اُس کے نزدیک پیری مریدی کی یہ شکل جو آج کل ہمارے ہاں رائج ہے، بے کار ہو گئی ہے۔ اس دور میں نئی زندگی نے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اور اب ہمارے ہاں سے تو جاگیرداری بھی جا رہی ہے۔ بادشاہوں کی مطلق العنانی اور جاگیرداروں کی زیادتیوں کی راہ میں صوفی ایک روک کا کام دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے جب بادشاہ اور جاگیردار نہ رہے تو معاشرہ میں صوفی کی اس وقت جو حیثیت ہے، اس کے لیے کوئی وجہ جواز نظر نہیں آتی۔ اس لیے ان صوفیوں کی گدیاں جتنی جلدی مٹ جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ بے شک ایک زمانہ تھا کہ صوفیا اسلامی تہذیب کے بہترین ترجمان تھے۔ اور وہ اس کے محافظ بھی ہوتے تھے۔ لیکن اب جو ہماری زندگی نئی کروٹ لے رہی ہے، اس میں صوفیا کا موجودہ شکل میں باقی رہنا قوم کے حق میں بجائے مفید کے سخت خطرناک نظر آ رہا ہے۔

ہماری نئی زندگی کی عمارت بالکل نئی بنیادوں پر اُٹھائی جا رہی ہے۔ اس میں نہ بادشاہ کے لیے جگہ ہے، نہ جاگیردار کے لیے۔ یہ زندگی کا جمہوری دور ہے اور جمہوری اصولوں پر ہی اب زندگی کی نئی تنظیم ہوگی۔ ایک طرف ہمارا

نمائندہ حکومت کا تصور ہے، جو خود ارادیت کے اصولوں پر فاتح ومفتوح اور
حاکم ومحکوم میں صدیوں سے جو کشمکش چلی آتی ہے، اس کو ختم کرنا چاہتا ہے۔
اور دوسری طرف فلاحی مملکت کا تصور اور اشتراکیت اور کمیونزم ہے، جو دنیا
کی معاشی عدم مساوات کو ہمیشہ کے لیے مٹانے میں کوشاں ہے۔ اور اس کا کہنا
ہے کہ اگر معاشی عدم مساوات ختم ہو گئی تو امیر وغریب اور مالک ومزدور کے یہ
جھگڑے بھی نہ رہیں گے۔ سارے انسان ایک سے ہوں گے۔ کوئی دوسرے
پر ظلم نہیں کر سکے گا اور سب مل جل کر رہ سکیں گے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جمہوری طرز حکومت
اور اشتراکی معاشی نظام نئی زندگی کو پوری طرح منظم کرنے میں، جیسا کہ ان کا دعویٰ
ہے، کامیاب ہو گئے، تو کیا اس سے زندگی کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے؟
کیا یہ واقعہ نہیں کہ زندگی کی یہ ساری تنظیم اس کے خارجی یا مادی پہلو کی تنظیم ہوگی۔

یقیناً اس خارجی تنظیم کا اثر انسان کی باطنی زندگی پر بھی ضرور پڑے گا، لیکن نفسیات
کے جدید علم نے انسان کے باطن میں ذہن لاشعور کے آتشیں مادوں کا جو انکشاف
کیا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ زندگی کی یہ خارجی تنظیم ان عقدوں کو بھی حل کرنے میں پوری
طرح کامیاب ہو سکے۔ مانا کہ انسان کی مادی زندگی بڑی اہم ہے، لیکن فرائڈ
اور اس کے متبعین کی نفسی تحقیقات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کی باطنی
زندگی اس کی مادی زندگی سے کم اہم ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ سیاسی استبداد
اور معاشی استحصال کی موجودگی میں دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا، لیکن آخر اس کا
ثبوت کیا ہے کہ اگر انسانوں کی نفسی الجھنوں کا خاطر خواہ حل نہ ہوا تو یہی الجھنیں
آگے چل کر نئی جنگوں کا باعث نہ بنیں گی۔ یہ ہولناک جنگ جو ابھی ابھی ختم ہوئی
ہے، اس کو دیکھتے ہوئے بڑی جرأت ہوگی اگر ہم جرمنی میں نازیت کے فروغ

اور اس کی سفاکی کا ذمہ دار تمام تر سیاسی اور معاشی اسباب کو بتائیں ۔ اور ہم ان ذہنی الجھنوں کو بھول جائیں، جنھوں نے ہٹلر کو ہٹلر بنایا اور جن کی وجہ سے ساری کی ساری جرمن قوم ہٹلر کی حلقہ بگوش بن گئی ۔

انسانی نفس کی ان الجھنوں اور اس کے خطرناک نتائج پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر فرائڈ کا مشہور شاگرد یونگ لکھتا ہے :۔

واقعہ یہ ہے کہ لاشعور کے مقابلہ میں ذہن کا شعوری حصہ بہت ہی مختصر ہے ۔ یہ لاشعور ذہن میں ایک سخت چٹان کی طرح جس کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا ناممکن ہو، جما ہوا ہے ۔ اور اس تک ہماری رسائی بھی نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اس کے باوجود اس لاشعور کی حالت یہ ہے کہ بعض ایسے اسباب جن کا ہمیں علم بھی نہیں جب ان کا اس لاشعور کو اشارہ ہوتا ہے تو یہ ہم پر ایک خونخوار درندہ کی طرح حملہ کر دیتا ہے ۔"

یونگ کہتا ہے :۔

"اب تک تو یہ ہوتا رہا ہے کہ انسانوں کو جنگلی جانوروں، گرنے والی چٹانوں اور تباہ کن سیلابوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن آج اس زمانے میں انسان پر خود اپنے نفسی قوتوں کی زد پڑ رہی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی یہ نفسی زندگی ایک عالمگیر قوت ہے ۔ اور دنیا کی کل قوتوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ قوی تر ہے ۔"

ہمارے نزدیک اگر انسانیت نے بفرضِ محال سیاسی بدنظمی اور معاشی بدحالی کا مکمل علاج جمہوریت اور معاشی مساوات کے ذریعہ کر بھی لیا، تو جب تک وہ نفس کی ان شعوری اور لاشعوری قوتوں کو ضبط میں لانے کے لیے کوئی باطنی یا روحانی نظام نہیں لی

ڈھونڈھے گی، اُس وقت تک فرد اور جماعت کی زندگی میں وہ طمانیت پیدا نہیں ہو سکتی، جس کی ہر شخص کو آج تلاش ہے۔ یورپ کے ماہرینِ نفسیات نے انسان کی نفسی زندگی کی ان مخفی قوتوں کے سلسلے میں بڑی تحقیقات کی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ بعض مشہور یورپی اہلِ فکر آج یہ ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ خارجی زندگی کی تنظیم کے ساتھ ساتھ انسان کی باطنی زندگی کی اصلاح و تہذیب بھی ضروری ہے۔ تاکہ ان دونوں میں پوری ہم آہنگی ہو۔ اور اس دور میں انسانیت جن روگوں میں مبتلا ہے، اس طرح وہ ان سے خلاصی حاصل کر سکے۔

یہ ماننا پڑے گا کہ اس سلسلے میں اسلامی تصوف کا علمی اثاثہ انسانیت کے لیے بڑا مفید ہو سکتا ہے۔ ہمارے تصوف کی یہ ایک ہزار برس کی تاریخ نفس کی انہیں قوتوں کی چھان بین اور ان کے تزکیہ و اصلاح کی تاریخ ہے۔ بےشک اہلِ تصوف نے ان مسائل کو اپنے زمانے کے رنگ میں پیش کیا۔ اور ان کے زمانے میں علم و فکر کا جو ڈھانچہ تھا، اُسی میں ہمارے ان صوفیا نے اپنی تحقیقات کو بٹھانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی تصنیفات پڑھیں۔ بحث و تنقید کی نئی روشنی میں ان کو حل کریں۔ اور پھر اپنی نئی زندگی کی تشکیل میں ان سے مدد لیں۔ یہی مقصد ہے جس کے پیشِ نظر "القول الجمیل" کا اُردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

محمد سرور

مقدّمہ

حضرت جنید بغدادی رح جو سلسلۂ تصوف کے بانی مانے جاتے ہیں، فرماتے ہیں :۔ علمنا ھٰذا مُشَیَّدٌ بالکتابِ وَالسُّنّۃِ یعنی ہمارا یہ علمِ تصوف کتاب وسنت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک اور جگہ تصوف ہی کے متعلق اُن کا ارشاد ہے کہ ہدایت کے تمام راستے صرف اُسی کے لیے کھلے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہے۔ حضرت جُنیدؒ کے بعد اور بھی بڑے بڑے صوفیا گزرے ہیں جو برابر اس بات پر زور دیتے رہے کہ ہر حقیقت، جو شریعت کے خلاف ہے، گمراہی ہے۔ اور ہر شریعت جو حقیقت سے خالی ہے ایک معطل چیز ہے۔ لیکن اربابِ تصوف کی ان صاف اور واضح تصریحات کے باوجود بے شک بعد میں ایسے صوفیا بھی پیدا ہوئے، جنہوں نے حقیقت اور شریعت دونوں کی زندگی میں جو اہمیت ہے، اس کو نظر انداز

کر دیا۔ اس طرح ان کے افکار و اعمال کتاب و سنت کے بتائے ہوئے جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے۔ اور اس کی وجہ سے ان کا تصوف مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے انتشار کا باعث بن گیا۔

اس آخری دور میں ہندوستان میں حضرت مجدد الفِ ثانی واقعی وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے تصوف کو فکری اور عملی بے راہروی سے نکال کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ آپ نے اپنی زندگی میں پوری جدوجہد کی کہ تصوف صحیح معنوں میں "مُشَیَّدٌ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ" کے مسلک پر آجائے۔ آپ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ نے اسی کام کو آگے بڑھایا۔ اس سلسلے میں شاہ صاحب کی زیادہ تر توجہ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کی طرف رہی۔ چنانچہ آپ کے زمانے میں تصوف کے جو علوم تھے؛ اور صوفیا میں جو آداب و اشغال رائج تھے، شاہ صاحب نے ان پر بحث و تنقید کی۔ اور بتایا کہ کہاں تک تصوف کے ان علوم کی کتاب و سنت سے تائید ہوتی ہے اور کس حد تک صوفیا کے مروجہ آداب و اشغال کو صراطِ مستقیم پر رہتے ہوئے قبول کیا جا سکتا ہے۔ "القول الجمیل" میں ان ہی آداب و اشغال کا بیان ہے۔

سب سے پہلے زیرِ نظر کتاب میں شاہ صاحب نے اس امر پر بحث کی ہے کہ آیا صوفیا میں مرید سے جو بیعت لینے کا رواج ہے، کتاب و سنت کی رو سے یہ جائز بھی ہے یا نہیں؟ شاہ ولی اللہ صاحب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ اور اس کے بعد تابعین کا جو زمانہ تھا، اُس میں اس قسم کی بیعت کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں مسلمانوں میں صرف ایک ہی بیعت کا رواج تھا اور وہ بیعتِ خلافت تھی۔ لیکن اس کے بعد یک زمانہ آیا جس میں صوفیا نے مریدوں سے بیعت لینی شروع کی۔ یہاں شاہ صاحب اس بیعت؟

تاریخی پس منظر بتاتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں بیعتِ تصوف کا رواج کیوں ہوا،
اس کو بالتفصیل بیان فرماتے ہیں۔

بیعت تصوف کے جواز میں شاہ ولی اللہ صاحب یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کئی قسمیں مروی ہیں۔ صحابہ جب اسلام
قبول کرتے تو آپؐ ان سے بیعت لیتے۔ یہ بیعتِ اسلام تھی۔ اسی طرح ہجرت
کے لیے بیعت لی جاتی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے لیے بھی
بیعت لی۔ اس طرح تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے، کسی سے سوال نہ کرنے،
مُردوں پر نوحہ نہ کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے صحابہ سے بیعت
لینا بھی آپؐ سے مروی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:۔

"خلافتِ راشدہ میں خلیفہ راشد کے ہاتھ پر جو بیعت ہوتی
تھی، یہ بیعت ان سب امور پر حاوی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب
تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ آیا تو خلافت کی وہ پہلی حیثیت قائم
نہیں رہی تھی۔ لیکن اس دور میں بیعتِ خلافت کے علاوہ اس
بیعت کا اس لیے رواج نہ ہو سکا کہ اس پر بیعتِ خلافت کا گمان ہوتا۔
ظاہر ہے اس سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا۔ پھر ایک دور آیا،
جس میں ایک طرف تو بیعتِ خلافت کی رسم ہی جاتی رہی اور دوسری طرف
حکومت کو مسلمانوں کے تزکیۂ نفوس، اصلاحِ اخلاق نیز امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر سے کوئی تعلق نہ رہا۔ ان حالات میں صوفیا کے لیے
اس بات میں کوئی قباحت نہ رہی کہ وہ مریدوں سے بیعت کا سلسلہ
شروع کر دیتے۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جب صوفیا کے طریقے وجود
میں آتے ہیں۔ اور ان میں بیعت کا رواج ہوتا ہے۔"

الغرض شاہ صاحب کے نزدیک صوفیا میں بیعت کا یہ سلسلہ اسلام کی تاریخ کے ایک خاص دور میں ملت کی تہذیبی، اخلاقی اور اجتماعی ضرورتوں کی بنا پر وجود میں آیا۔ اس لیے اگر بیعتِ تصوف سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

دوسری فصل میں بیعت کی شرائط سے بحث کی گئی ہے۔ بیعت کرتے وقت مُرید کا مرشد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دینا۔ اس فعل کی نفسیاتی اعتبار سے کیا اہمیت ہے؟۔ اس بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں "انسان کے اندر جو باطنی کیفیات پیدا ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کیفیات کو چند مخصوص اقوال و اعمال سے اس طرح متعلق کر دیا ہے، گویا یہ اقوال و اعمال اُن نظر نہ آنے والی باطنی کیفیات کا قائم مقام بن گئے ہیں"۔ ان اقوال و اعمال کو دوسری جگہ شاہ صاحب نے "رسوم" کا نام دیا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک رسوم کے بغیر انسان کی کوئی باطنی کیفیت اس دنیا میں متشکل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ کیفیت پیدا کرنے کے لیے لامحالہ ان رسوم کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسانی سیرت کی تعمیر اور اس کی شخصیت کو بنانے میں ان رسوم کو جو اہمیت حاصل ہے اُسے آج کل کے ماہرینِ نفسیات بھی مانتے ہیں۔ یونگ کہتا ہے:-

"انسانوں کی بہت بڑی اکثریت اپنی شخصیت کو رسوم ہی کے ذریعے نشو و نما دے سکتی ہے۔ اسی بنا پر اس کا یہ قول ہے کہ میرا یہ ایمان ہے کہ (   ) یعنی رسوم اجتماعی زندگی کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے۔ بے شک یہ سب رسوم نصب العین نہیں ہوتیں۔ لیکن بہر حال یہی رسوم ہی

بہتوں کے لیے نصب العین تک پہنچنے کا ذریعہ ہوتی ہیں "۔

شاہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ جب کوئی شخص توبہ کرتا اور ترکِ معاصی کا عہد کرتا ہے، اور تقوٰی پر مضبوطی سے قائم رہنے کا تہیہ کرتا ہے تو اُس کا عزم نفس کی ایک داخلی کیفیت ہے۔ اسی داخلی کیفیت کا قائم مقام صوفیا نے بیعت کو بنایا ہے۔ یعنی بیعت محض ایک بے کار رسم نہیں ہے۔ بلکہ اس رسم کے پیچھے ایک نفسی کیفیت ہے، جو بیعت کرنے والے کے باطن میں پیدا ہوتی ہے۔

اِسی فصل میں مُرشد یعنی بیعت لینے والے میں کیا کیا خصوصیات ہونی چاہییں، اُن کا بھی ذکر ہے۔ مُرشد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن اور سنت کا عالم ہو۔ عادل و متقی ہو۔ دنیا سے بے نیاز ہو۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل ہو۔ طبیعت میں تذبذب نہ ہو۔ عقل تام رکھتا ہو۔ صاحب مروت ہو۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک مدتِ دراز تک مشائخ کی صحبت میں رہ کر تربیت حاصل کر چکا ہو۔ مُرید یعنی بیعت کرنے والے کے لیے شاہ صاحب نے اس کا عاقل و بالغ ہونا اور شوق و رغبت رکھنا ضروری قرار دیا ہے۔

تیسری فصل میں مُرید کی تعلیم و تربیت کا بیان ہے۔ اس سلسلے میں مرید کے لیے سب سے پہلی چیز کتاب و سنت کے مطابق عقیدے کو ٹھیک کرنا، پھر تمام انبیا کی نبوت پر بالعموم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر بالخصوص ایمان لانا ہے۔ اس کے بعد مُرید کو چاہیے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچنے اور صغیرہ گناہوں کے ارتکاب سے نادم ہونے کا عہد کرے۔ ارکانِ اسلام کو اُن کی تمام شرطوں کے ساتھ بجالائے۔ معاشی ضروریات، خانگی معاملات اور خرید و فروخت وغیرہ کی طرف متوجہ ہو۔ اور ان کو سنت کے مطابق سرانجام دینے کی کوشش کرے۔ اس

ضمن میں مُرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریا کاری، غرور، حسد اور کینہ سے اپنے آپ کو پاک رکھے۔ تلاوتِ قرآن کا پابند ہو۔ آخرت کا ذکر کرتا رہے۔ صبح و شام اور سوتے وقت کی جو مسنون دعائیں ہیں، ان کا برابر ورد رکھے۔ اور پھر ذکر و اذکار کے حلقوں اور مساجد میں حاضر ہوتا رہے۔

جب مُرید کو ان عقائد، اعمال اور آداب میں رسوخ حاصل ہو جائے تو پھر اُسے صوفیا کے باطنی اشغال کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ چوتھی، پانچویں اور چھٹی فصل میں شاہ ولی اللہ صاحب نے قادری، چشتی اور نقشبندی طریقے کے اشغال کا ذکر کیا ہے۔ ان اشغال کی پوری تفصیل تو آپ خود کتاب میں دیکھ لیں گے۔ یہاں ہم اس ضمن میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان اشغال کو ایک طرح کی نفسی ریاضتیں سمجھنا چاہیے، جن کے کرنے سے سالک کی طبیعت میں یکسوئی حاصل ہوتی ہے، اور اس طرح وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی توجہ کو دنیا کی ہر چیز سے ہٹا کر پہلے اپنی طرف اور پھر ذاتِ حق کی طرف مرکوز کر دے۔ بے شک صوفیا کے یہ اشغال اس صورت میں کتاب و سنت سے ثابت نہیں اور نہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں ان کا رواج تھا۔ اس لیے ان اشغال کی فی نفسہٖ کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن صوفیا نے ان اشغال کو جس مقصد کے لیے اختیار کیا، وہ مقصد یعنی قربِ الٰہی کتاب و سنت کی تعلیمات کا عین منشا و مطلوب ہے۔ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی کو "احسان" سے تعبیر فرمایا۔ اور اُسے اسلام اور ایمان کے بعد کے درجہ میں رکھا۔

صوفیا کے ان باطنی اشغال کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص جسمانی کسرت کرتا ہے۔ ڈنڑ پیلتا ہے۔ دوڑ لگاتا ہے اور اس طرح اپنے جسم کو خوب مضبوط بناتا ہے۔ اس سے اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی جسمانی طاقت کو کسی نیک مصرف میں لائے۔ ظاہر

ہے۔ اس شخص کا کسرت کرنا فی نفسہٖ نیک کام نہیں ہے۔ لیکن چونکہ یہ کسرت ذریعہ بنتی ہے اُس کے لیے نیک کاموں کے کرنے کا۔ اِس لیے یقیناً اس کا اس لحاظ سے نیک کاموں میں شمار ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ صحابۂ کرام نے کیوں ان اشغال کو نہیں کیا؟ اس سلسلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ایسی تاثیر تھی کہ قربِ الٰہی اور حضوریِ قلب کے لیے صحابہ کو ان اشغال کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں بھی ایک حد تک آپؐ کی اس تاثیر کا اثر رہا۔ لیکن جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ ایک طرف تو پہلوں کا اثر زائل ہوتا چلا گیا۔ اور دوسری طرف نئے نئے فتنے پیدا ہوتے گئے۔ اس لیے بعد والوں کو قربِ الٰہی کے حصول کے لیے ان نفسی ریاضتوں سے مدد لینے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ بالکل اُسی طرح جیسے ایک شخص پیدائشی طور پر مضبوط و توانا ہے۔ اس کی طبیعت بھی صالح ہے۔ ظاہر ہے اُسے اپنی تندرستی کے لیے زیادہ ورزش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ایک آدمی جو نسبتاً کمزور ہو۔ اُس کو تندرستی کے اس معیار تک پہنچنے کے لیے ظاہر ہے، سخت ورزش کرنی پڑے گی۔

شاہ صاحب صوفیا کے ان اشغالؒ کے جواز میں لکھتے ہیں :-

"تم مجھ سے پوچھو گے کہ آخر ذکر میں اس طرح ضربیں لگانے زور زور سے بولنے اور اس ضمن میں دائیں زانو، بائیں زانو اور قلب کی رعایت کرنے میں کیا حکمت ہے؟ سو بات یہ ہے کہ انسان طبیعتاً کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ وہ فوراً اِدھر اُدھر متوجہ ہو جاتا ہے۔ ہر آواز پر کان لگا دیتا ہے اور اُس کے دل میں ہر وقت طرح طرح کے خیالات چکر لگاتے رہتے ہیں۔ مشائخ نے ذکر میں یہ طریقہ اس لیے

وضع کیا ہے کہ اس سے ذکر کرنے والے کی توجہ اپنے سوا کسی اَور طرف نہیں جاتی۔ اور باہر کے خیالات اس کے دل پر نہیں آنے پاتے۔ چنانچہ شروع میں ذاکر کی توجہ سب طرف سے ہٹ کر اپنے نفس پر مرکوز ہوتی ہے۔ پھر بتدریج وہ نفس سے ہٹ کر ذاتِ حق کو اپنا مرکز بنا لیتی ہے۔"

غرضیکہ ذکر و اذکار اور مراقبے کے یہ اشغال طبیعت کو یکسو کر کے اللہ کی طرف متوجہ کرنے کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ ان اشغال کی اہمیت اِس لیے اب اَور بھی بڑھ گئی ہے کہ صدیوں سے لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں نے انہی اشغال کو توجہ الی اللہ کا ذریعہ بنایا ہے۔ اتنے لمبے عرصے تک، اور انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کا غیر معمولی خلوص اور انہماک کے ساتھ ان اشغال کو برابر کرتے رہنا، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان اشغال کی تکنیک منجھتے منجھتے کمال کے اِس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ اب ان کی تاثیر کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

علاوہ ازیں صوفیوں کے ان اشغال کی ایک اَور اہمیت بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر شخص جانتا ہے کہ صوفی محض اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور اُس کی ذات کو عقل کے ذریعہ جاننے پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ خدا کو اپنے اندر محسوس کرنا چاہتا ہے۔ وہ چشمِ دل سے اُسے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ربط و ضبط رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے قرب اور معیت کا طلبگار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں عقل و نقل سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ان کے لیئے "مشاہدہ و حال" کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ "مشاہدہ و حال" صرف وجدان ہی کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ ذکر جہر، ذکر خفی، مراقبہ اور اسی قبیل کے جو اَور اشغال صوفیا نے وضع فرمائے ہیں، ان کا اثر یہ بھی ہے کہ ان کے کرنے سے طبیعت میں گرمی پیدا ہوتی ہے لیکن اس گرمی

میں طبعی حیوانیت کا شائبہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ صوفی ان اشغال سے پہلے ہی طاعات، عبادات اور اعمالِ صالحہ کے ذریعہ اپنے نفس کا تزکیہ یا آج کی نفسیاتی اصطلاح میں کر چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس گرمی کی تاثیر سے اُس پر ایک محویت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت میں وہ اپنی جبلتوں کے شکنجوں اور اپنی عقل کی زنجیروں سے آزاد ہو کر وجدان کی سرحد پر جا پہنچتا ہے۔ اور پھر اُس کے اندر جتنی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے مطابق اُس پر روحانی حقائق منکشف ہوتے ہیں۔

اس کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

"تصوف کے جتنے طریقے ہیں، اُن سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفسِ ناطقہ کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے اس کیفیت کا نام "نسبت" ہے۔ اور اس کو نسبت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتساب اور ارتباط سے"۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک یہ "نسبت"، ملائکہ سے مشابہ ہوتی ہے اور عالمِ جبروت کے جو حقائق ہیں، اُن کا یہ مشاہدہ کرتی ہے۔ کتاب کی ساتویں فصل میں اس "نسبت" کی حقیقت پر بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ "اس نسبت" کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو طریقت کے اشغال و وظائف سے دراصل مقصود بھی یہی ہے کہ طالب ان نسبتوں میں سے کسی ایک "نسبت" کو حاصل کر لے اور وہ "نسبت" اس کے نفسِ ناطقہ کے لیے بحیثیت ایک مستقل ملکہ بن جائے"۔

اس مقام پر بھی شاہ صاحب اس امر کی تصریح فرما دیتے ہیں :-

"کسی کو یہ گمان نہ گزرے کہ اس "نسبت" کو صرف صوفیا کے ان

اشغال و وظائف ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے، بے شک

اِس "نسبت" کے حصول کا ایک ذریعہ یہ اشغال و وظائف ضرور

ہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ صحابۂ کرام اور تابعین

اِس "نسبت" سے بہرہ مند ہوتے اور وہ ان اشغال (وظائف) کو

سرے سے جانتے ہی نہ تھے"۔

یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ قربِ الٰہی کی یہ نسبت اَور طریقوں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے بڑی تفصیل سے وہ طریقے بتائے ہیں، جن کے ذریعے صحابہ اور تابعین اِس "نسبت" کو حاصل کرتے تھے مثلاً" اِن میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ پورے خضوع و حضور کے ساتھ تنہائی میں نماز پڑھتے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ ہر وقت باطہارت رہتے اور موت و آخرت کا برابر ذکر کرتے۔ اور اس طرح ان کو "نسبت" حاصل ہو جاتی۔ الغرض شاہ صاحب کے نزدیک صوفیا کے یہ اشغال و وظائف خود مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ ان کی حیثیت قربِ الٰہی کی "نسبت" کے حصول کے لیے ایک ذریعہ کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شاہ صاحب نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ "نسبت" کا حصول صرف انہی ذرائع تک محدود نہیں۔ خود صحابہ اور تابعین نے اِس "نسبت" کو اَور طریقوں سے حاصل کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں اصل مقصد اِس "نسبت" کو حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ اِس "نسبت" کا تعین تو کتاب و سنت نے کر دیا لیکن اس کے حصول کے طریقوں کا مسئلہ زمانے کے مزاج اور لوگوں کی استعداد پر چھوڑ دیا۔

کتاب کی آٹھویں فصل میں شاہ صاحب نے ان وظائف اور تعویذات کو

بیان کیا ہے، جو آپ کو والدِ بزرگوار شاہ عبدالرحیم نے تلقین فرمائے تھے۔ ان وظائف اور تعویذات کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ فلاں وظیفہ فلاں مصیبت

کی روک ہے اور یہ تعویذ اس بیماری کا علاج ہے۔ اس ضمن میں اُنہوں نے بہت سی مصیبتوں اور بیماریوں کے نام گنائے ہیں، جن میں یہ وظائف اور تعویذات مؤثر ہو سکتے ہیں۔ ہم فی الحال اس بحث میں نہیں پڑتے کہ آیا ان وظائف اور تعویذات کی کوئی تاثیر ممکن بھی ہے یا نہیں؟ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کیا حالات تھے اور کون سا زمانہ تھا، جس میں شاہ صاحب کے والد انہیں یہ وظائف اور تعویذات بطور وراثت کے دیتے ہیں۔ اور شاہ صاحب آئندہ آنے والوں کے لیے انہیں اس کتاب میں جمع کر دیتے ہیں۔

"القول الجمیل" آج سے قریباً دو سو برس پہلے لکھی گئی۔ اُس وقت علم طب، وہی جسے اس زمانے میں یونانی طب کہا جاتا ہے موجود تھا۔ اور خدا کے فضل سے اچھے طبیب بھی ہوتے تھے لیکن ان کی تعداد نسبتاً کم ہوتی۔ اور وہ بھی بڑے بڑے شہروں میں۔ اور وہاں بھی ان طبیبوں تک صرف اُونچے طبقوں کے لوگ ہی پہنچ پاتے تھے۔ عام لوگ بیشتر عطائی طبیبوں کی طرف رجوع کرتے یا سنے سنائے نسخوں اور ٹوٹکوں سے بوقتِ ضرورت کام لیتے۔ اس زمانے میں وباؤں کی روک تھام کے لیے جس وسیع پیمانے اور موثر طریقے سے فوری انتظامات ہو سکتے ہیں، اُن دنوں یہ باتیں کسی کے وہم و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھیں وبائیں پھیلتیں تو کوئی ان کا انسداد کرنے والا نہ ہوتا۔ اگر کوئی خوش نصیب ہوا تو اسے طبی مدد مل گئی۔ ورنہ ہزاروں خدا پر آس لگائے ان مصیبتوں کو جھیلا کرتے۔ جن کی اجل آئی ہوتی وہ تو مر جاتے اور جن کو بچنا ہوتا وہ بچ جاتے۔

اس معاشرے میں اور ان حالات میں صوفی کا ایک منصب تھا۔ وہ ایک حد تک عالم دین تو ہوتا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑی بہت حکمت یعنی فلسفہ بھی سیکھتا۔ اور اُس زمانے میں اس حکمت کے ساتھ طب بھی شامل

ہوتی تھی۔ چنانچہ ہمارے ہاں صوفیا عالم دین بھی ہوتے۔ حکیم بھی اور تھوڑے بہت طبیب بھی۔ اور صوفی وہ تھے ہی۔ یعنی وہ روحانی طبیب کے ساتھ جسمانی طبیب بھی ہوا کرتے۔ لوگ تزکیۂ نفوس کے لیے اُن کے پاس آتے تو وہ اُن کو وظائف اور اشغال تلقین فرماتے۔ اسی طرح جب وہ بیمار ہوتے تو پھر بھی وہ انہیں روحانی طبیبوں کی طرف ہی رجوع کرتے تھے۔ وہ ان کے لیے دوا بھی تجویز کرتے اور ان کو دُعا بھی بتاتے۔ صوفی کا یہ منصب گو اب عام نہیں رہا لیکن کہیں کہیں اس زمانے میں بھی آپ کو اس طرح کے صوفی طبیب لوگوں کا روحانی اور جسمانی علاج کرتے نظر آئیں گے۔ اُس زمانے میں یہ صوفی طبیب بھی ہوتے تھے اور صوفی بھی۔ لوگوں کو ان کی دعاؤں کے قبول ہونے پر بھی یقین ہوتا تھا۔ اور وہ ان کی دواؤں کی تاثیر پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔

ان صوفیا کی تجویز کردہ دواؤں کی تاثیر پر تو شاید آج کسی کو زیادہ اعتراض نہ ہو۔ البتہ ان کی بتائی ہوئی دعاؤں اور خاص طور پر ان کے وظیفوں اور تعویذوں کی تاثیر کو ثابت کرنا اس زمانے میں بڑا مشکل ہے۔ یہ مسئلہ قدرے دقیق بھی ہے۔ پھر اس پر گفتگو کرنے کا یہ موقع بھی نہیں۔ بہرحال اس سلسلے میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں

"علم نفسیات اب تک انسان کے باطن میں جو مخفی خزانہ ہے، اُس کے صرف ایک گوشے سے پردہ اُٹھانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ انسان کے اندر جو نفسی قوتیں پوشیدہ ہیں، ان کو یوں سمجھنا چاہیے، جیسے کوئی اتھاہ سمندر ہو کہ ذرا ہوا چلی اور اس میں طوفان آ گیا۔ اور موجیں اُٹھ اُٹھ کر آسمان تک پہنچنے لگیں۔ بات یہ ہے کہ انسان کی جسمانی قوتوں کی تو حد معلوم ہے لیکن اس کے باطن میں جو نفسی قوتیں ہیں، ان کی وسعت پذیری، اثر آفرینی اور

طاقت کا ہمارا علم اب تک صحیح اندازہ نہیں کر سکا۔ چنانچہ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت آئے کہ اولیا کی وہ کرامات جن پر یقین کرنا آج ہمیں مشکل نظر آتا ہے، علم النفسیات کے انکشافات ان کرامات کو انسان کی نفسی قوتوں کا ایک فطری مظہر ثابت کر دیں۔"

وظائف اور تعویذات پر ایک اور اعتراض ہو سکتا ہے۔ مشکلات اور بیماریوں میں وظائف اور تعویذات پر بھروسہ کرنا بسا اوقات انسان کے اندر ترکِ اسباب کا رجحان پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ بعد میں ترکِ سعی و عمل نکلتا ہے۔ جب زندگی میں سعی و عمل کا جذبہ ہی نہ رہا تو ظاہر ہے کہ یہ زندگی نہیں موت ہے۔ چنانچہ ہر وہ رجحان یا خیال یا عقیدہ جو ترکِ اسباب پر مائل کر دے، وہ کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اب اگر کوئی شخص تعویذ کو کسی طبیب کے علاج کا بدل بناتا ہے۔ یا وہ تلاشِ رزق میں ہاتھ پاؤں ہلانے کے بجائے صرف دعاؤں کو کافی سمجھتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ چیز اسلام کی تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت وضاحت سے بتایا ہے۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ یعنی انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔ لیکن آپ فرض کریں کہ ایک انسان ہے جس کا کہ مادی اسباب پر پورا قابو نہیں۔ اور تمام تر سعی و عمل کے باوجود جو چیز اُسے مطلوب ہے وہ اُس کی دسترس سے باہر ہے۔ اس حالت میں یا تو وہ نا اُمید ہو کر خودکشی کرنے پر تُل جائے گا۔ یا زندگی سے مایوس ہو کر جیتے جی مر رہے گا۔ لیکن زندگی بسر کرنے کی ایک صورت اَور بھی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انسان سمجھے کہ جہاں تک میرا زور چل سکتا تھا، میں نے اپنا زور چلا لیا۔ جن اسباب تک بھی میری رسائی ممکن تھی، میں نے ان سب کو آزما لیا۔ اب اس

سے آگے جانا میری حد وسع سے باہر ہے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو اُس مسبّب الاسباب کے حوالہ کردوں جو سب کا کارساز ہے۔ وہ اگر چاہے تو میری مراد پوری کردے اور اگر اس کی مرضی نہیں تو جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میں نے تو اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ میں اُس کی مرضی پر رضامند ہوں ...... یہ ہے وہ منزل جہاں انسان عموماً وظائف اور تعویذات کا سہارا لیتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس منزل میں انسان کا یوں سہارا لینا زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا۔

نویں فصل میں شاہ ولی اللہ صاحب نے عالمِ ربّانی کو چند نصیحتیں فرمائی ہیں اور اُسے بتایا ہے کہ وہ طلبۂ علم کو کس طرح تعلیم دے۔ سالکوں کو کیسے اشغالِ طریقت کی تلقین کرے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کون سا طریقہ اختیار کرے۔ آپ نے عالمِ ربانی کو تاکید فرمائی ہے کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو، فقرا اور طالب علموں کی خبر گیری کرے اور دولتمندوں کی صحبت سے حتے الوسع بچے۔ آخر میں آپ نے جاہل صوفیوں، اَن پڑھ عبادت گزاروں، خشک مزاج فقیہوں، ظاہر پرست محدّثوں اور حد سے بڑھے ہوئے معقولیوں سے احتراز کرنے کی نصیحت کی ہے۔

دسویں فصل میں وعظ و تذکیر کے آداب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِسی سلسلے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ واعظ کو یہ چاہیے کہ سب سے پہلے وہ ایک مسلمان کے اوصاف کا تصور کرے۔ یعنی یہ کہ ایک مسلمان کے اعمال کیسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو کس طرح قابو میں رکھتا ہے۔ اس کی قلبی کیفیات کیسی ہوتی ہیں۔ اور وہ کس طرح برابر ذکر واذکار کرتا رہتا ہے۔ واعظ خود ان اوصاف کا اپنے دل میں تصور کرے۔ اور اس کے بعد اس کی یہ کوشش

ہو کہ اپنے وعظ کے ذریعے ان اوصاف کو سامعین کے دلوں میں اس طرح نقش کر دے کہ وہ ان اوصاف کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔

آخری فصل میں آپ نے اپنے سلسلہ طریقت کو اپنے سے شروع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا ہے اور یہیں کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سب تعریف ہے، جس نے بنی آدم کے دلوں کو اِس طرح بنایا ہے کہ وہ انوار الٰہی کے فیضان کی استعداد رکھتے ہیں۔ اور ان میں اسرار و معارف کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ نیز اس نے برگزیدہ اور ممتاز انبیا کو مبعوث فرمایا کہ وہ ان اسرار و معارف کے حصول کے لیے ذکر و اذکار اور طاعات و عبادات کی دعوت دیں اور ان کی طرف لوگوں کی رہنمائی فرمائیں۔ انبیا کا وارث اللہ تعالیٰ نے علمائے راسخین کو بنایا ہے، جو اُن کے علم اور اُن کی دعوتِ رشد و ہدایت میں اُن کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ ان علمائے راسخین میں سے ایک نہ ایک جماعت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضرور حق پر قائم رہتی ہے، اور اگر اشرار اُس کے مخالف اور دشمن بھی ہوں تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس جماعت کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے شمع ہدایت بنایا ہے کہ وہ ان کے ذریعہ اپنی طبیعت اور بشریت کی تاریکیوں میں اللہ تعالیٰ کے تقرب کی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ جس کا دل بیدار ہے۔ اور اُس نے دھیان دے کر سُنا وہ تو ہدایت پا گیا۔ اور اس زندگی کے بعد اُس کے لیے دوامِ نعمت، بہشت کے باغات اور

نہریں ہیں۔ لیکن جس نے روگردانی کی اور اُس سے سرکشی ہوئی سو وہ گمراہ ہوا۔ اُس کے لیے آخرت میں دوزخ اور کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ہے۔ اور کوئی اُس کا وہاں مددگار نہیں ہوگا۔

بے شک ہم اللہ ہی کی تعریف کرتے۔ اُسی سے مدد مانگتے اور اُسی سے ہی مغفرت چاہتے ہیں۔ اور اپنے نفس کی بُرائیوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں سے اسی کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی پھر اُس کو کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے راہِ ضلالت پر ڈال دیا تو پھر اُس کو کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا نہیں۔ نیز ہم اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اور ہم اس کی بھی شہادت دیتے ہیں کہ سیدنا محمدؐ اُس کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ اُس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا۔ وہ خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپؐ پر، آپؐ کی آل پر، اور آپؐ کے اصحاب پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ اُن کو برکت دے اور اُن کو مزید سلامتی عطا فرمائے۔

امابعد۔ یہ بندۂ ضعیف خداوندکریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم۔ اللہ ان دونوں کو اپنے فضل کے وسیع دامن میں لے لے۔ اور ان کو آخرت میں دوامِ نعمت عطا کرے۔ عرض کرتا ہے کہ یہ فصلیں مشتمل ہیں طریقت کے اصولوں اور ان کے متعلقہ مسائل پر، جو ہم نے اپنے نقشبندی جیلانی اور چشتی مشائخ سے استفادہ کیے۔ ہم ان کا نام "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" رکھا ہے۔ حَسْبِیَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ◆

بیعت کی حقیقت

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔
(اے محمد! بے شک جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں، وہ دراصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ بیعت کرنے کے بعد جس نے عہد شکنی کی تو اس عہد شکنی کا وبال اس کے نفس پر ہو گا اور جس نے اپنے عہد کو جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا تھا پورا کیا تو اللہ تعالیٰ اُس کو عنقریب بہت بڑا بدلہ دے گا)۔ نیز مشہور احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ صحابہ آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کیا کرتے تھے۔ کبھی یہ بیعت ہجرت کے لیے ہوتی۔ کبھی جہاد کی غرض سے بعض اوقات ارکان اسلام کو پابندی سے ادا کرنے کے لیے بیعت کی جاتی تھی۔ کبھی میدان جنگ میں کفار کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ لڑنے کے لیے بیعت کی صورت میں عہد و اقرار ہوتا۔ اور کبھی سنت کو مضبوطی سے پکڑنے، بدعات سے بچنے اور طاعات و عبادات کو زیادہ سے زیادہ شوق و رغبت سے کرنے کے لیے بھی بیعت لی جاتی تھی۔ اسی ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے۔ کہ آپؐ نے انصار کی عورتوں سے مُردوں پر نوحہ نہ کرنے کی بیعت لی تھی۔

ابن ماجہ کی روایت ہے کہ آپؐ نے فقرائے مہاجرین میں سے ایک جماعت سے اس امر کی بیعت لی تھی کہ وہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہیں کریں گے۔ چنانچہ ان کی یہ حالت تھی کہ ان میں سے اگر کسی کے ہاتھ سے کوڑا گر پڑتا تو وہ خود گھوڑے سے اُتر کر اُسے اُٹھاتا لیکن اس کے لیے کسی سے سوال نہ کرتا۔

اِس بات میں تو کوئی شک و شبہ نہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسا فعل ثابت ہو، جو آپؐ نے بطور عبادت کے کیا۔ اور آپؐ نے اس کے متعلق خاص اہتمام فرمایا۔ تو وہ فعل سنت سے کم درجہ کا نہیں سمجھا جائے گا۔ اب صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے۔ اور اس نے قرآن میں جو کچھ نازل فرمایا، اُس کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ نیز آپؐ قرآن و سنت کی تعلیم دیتے تھے اور اپنے پیروؤں کے اخلاق سدھارتے تھے۔ چنانچہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے جو کچھ آپؐ نے کیا، وہ بعد میں آپؐ کے خلفا کے لیے سنت بنا۔ اور جو بحیثیت قرآن اور حکمت کے معلم ہونے اور امت کے اخلاق سدھارنے کے سلسلہ میں آپؐ نے جو طریقہ اختیار فرمایا۔ وہ بعد میں علمائے راسخین کے لیے سنت بنا۔

اِس تمہید کے بعد ہم اصل مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان امور سے بیعت کا تعلق کس سے ہے؟۔ اِس بارے میں بعض لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ بیعت صرف خلافت تک محدود ہے۔ اور صوفیا جو اپنے مُریدوں سے بیعت لیتے ہیں۔ اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے۔ اِس سلسلے میں ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ارکانِ اسلام پابندی سے ادا کرنے کے لیے بیعت لیتے تھے۔ اور کبھی سنت پر مضبوطی سے عمل کرنے کی غرض سے بھی بیعت لی جاتی تھی۔ خود صحیح بخاری کی یہ حدیث

اس امر کی شاہد ہے کہ آپؐ نے جریرؓ سے بیعت لی اور بیعت لیتے ہوئے فرمایا:
"تم پر ہر مسلمان کی خیر خواہی لازم ہے"۔ یہ بھی مروی ہے کہ آپؐ نے انصار سے
بیعت لی اور اُن سے یہ شرط کی کہ وہ خدا کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی
ملامت سے نہ ڈریں۔ اور جہاں بھی ہوں، حق بات کہیں۔ چنانچہ ان کی کیفیت یہ
تھی کہ وہ اُمرا اور ملوک کے روبرو برملا طور پر غیر حق کی تردید اور اس کا انکار کرتے۔
یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے انصار کی عورتوں سے بیعت لی اور اُن سے شرط کی
کہ وہ مُردوں پر نوحہ نہیں کریں گی۔ الغرض یہ سب معاملات جن کے متعلق آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی، ان کا شمار خلافت میں نہیں ہو سکتا بلکہ ان کا تعلق
تزکیۂ اخلاق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے۔ یعنی ان روایات سے صاف
ظاہر ہے کہ بیعت محض خلافت تک محدود نہیں۔

بیعت کے معاملے میں اصل حقیقت یہ ہے کہ بیعت کی بہت سی قسمیں
ہیں۔ ان میں سے ایک بیعتِ خلافت ہے۔ اس کے علاوہ ایک بیعتِ اسلام
بھی ہے۔ پھر تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کی بیعت ہے۔ جہاں تک کفر سے
اسلام میں داخل ہونے کے وقت بیعت لینے کا تعلق ہے، یہ بیعت خلفا
کے زمانے میں متروک رہی۔ خلفائے راشدین کے عہد میں تو اس لیے اس
بیعت کا رواج نہ تھا کہ اُن کے زمانے میں زیادہ تر لوگ غلبہ و قہر اور تلوار کی
وجہ سے مسلمان ہوتے تھے نہ کہ تالیفِ قلوب اور دلیل و برہان کے ذریعہ سے۔
اور نہ وہ اپنی مرضی اور شوق سے اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ اِس لیے اُن سے
اسلام قبول کرتے وقت بیعت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ باقی رہا خلفائے
راشدین کے بعد کا زمانہ۔ اس میں تو بیشتر خلفا ظالم اور فاسق ہوئے جن کو
سنت کے قیام کا کوئی خیال ہی نہ تھا۔ چنانچہ جس طرح بیعتِ اسلام زمانۂ

خلفا میں متروک رہی، اسی طرح تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لیے بیعت لینے کا بھی اس عہد میں رواج نہ تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بیعتِ تقویٰ اس لیے متروک رہی کہ اُس وقت صحابہ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ جنہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیضانِ نور کا اکتساب کیا تھا اور آپؐ کے سامنے تربیت پائی تھی۔ ظاہر ہے انہیں اس امر کی حاجت نہ تھی کہ تقویٰ پر قائم رہنے کے لیے خلفا سے بیعت کرتے۔ لیکن ان کے بعد جو خلفا ہوئے ان کے زمانے میں بیعتِ تقویٰ اس لیے متروک رہی کہ اس سے اُمت میں انتشار پھیلنے کا خوف تھا۔ کیونکہ بیعتِ تقویٰ پر خلافت کی بیعت کا بھی گمان ہو سکتا تھا۔ اور اس سے فتنے اُٹھنے کا امکان تھا۔ اس زمانے میں صوفیا کے ہاں یہ دستور تھا کہ وہ بیعت کے بجائے خرقہ کو اس کا قائم مقام بناتے تھے۔ لیکن ایک وقت آیا جب خلفا میں بیعتِ خلافت کی رسم ختم ہو گئی تو صوفیا نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور اپنے مریدوں سے بیعت لینے لگے اور اُنہوں نے اس سنت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

بیعت کی شرائط

اب تم پوچھو گے کہ (۱) بیعت واجب ہے یا سنت؟ (۲) بیعت کے مشروع ہونے میں حکمت کیا ہے؟ (۳) بیعت لینے والے کے لیے کیا شرطیں ہیں؟ (۴) بیعت کرنے والے کی کیا شرائط ہیں؟ (۵) بیعت کرنے والے کے لیے بیعت کو پورا کرنا اور بیعت کو توڑنا کیا ہے؟ (۶) کیا ایک یا ایک سے زیادہ عالموں سے ایک شخص کا ایک سے زیادہ بار بیعت کرنا جائز ہے؟ (۷) سلف سے بیعت کے کون سے الفاظ منقول ہیں؟

تمہارے پہلے سوال کا جواب کہ بیعت سنت ہے یا واجب۔ یہ ہے کہ بیعت واجب نہیں سنت ہے۔ اس لیے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا تقرب چاہا۔ اس ضمن میں کہیں اس بات کی دلیل نہیں ملتی کہ جس نے آپؐ کی بیعت نہ کی وہ گنہ گار ہوا۔ اور نہ کسی امام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت نہ کرنے والے کو بُرا قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کا اجماع ہے کہ بیعت واجب نہیں۔

اب رہا دوسرا سوال کہ بیعت کے مشروع ہونے میں حکمت کیا ہے؟

سو تمہیں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دنیا میں یہ قانون جاری ہے کہ نفوس انسانی کے اندر جو نظر نہ آنے والی پوشیدہ کیفیات ہیں، اس نے ان کو ظاہری افعال واقوال کے ذریعہ ضبط میں لانے کا دستور بنایا ہے۔ اور ان ظاہری افعال و اقوال ہی کو اندرونی نفسی کیفیات کا قائم مقام مقرر فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر خدا، خدا کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا نفس کی ایک نظر نہ آنے والی اندرونی کیفیت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زبان سے اقرار کرنے کو ظاہر میں اس کا قائم مقام بنایا ہے۔ اسی طرح دو آدمیوں کا کسی چیز کی خرید و فروخت کے متعلق متفق ہونا ایک مخفی معاملہ ہے۔ لیکن خریدار اور فروخت کرنے والے کا زبان سے ایجاب و قبول کرنا اس کا ظاہر میں قائم مقام بن گیا۔ یہی مثال بیعت کی بھی ہے۔ جب ایک آدمی توبہ کرتا اور ترک معاصی کا عہد کرتا ہے اور تقویٰ پر مضبوطی سے قائم رہنے کا تہیہ کرتا ہے تو یہ ایک نفس کی داخلی کیفیت ہوئی۔ اس نفسی کیفیت کا قائم مقام بیعت کو بنایا گیا ہے۔

تیسرا سوال۔ بیعت لینے والے مرشد کے لیے کیا ضروری شرائط ہیں؟ سو مرشد کے لیے ایک شرط تو یہ ہے کہ وہ قرآن اور سنت کا علم رکھتا ہو۔ قرآن اور سنت کے علم سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ اس میں درجۂ کمال پر فائز ہو۔ مرشد کے لیے قرآن کا علم بس اتنا کافی ہے کہ اس نے تفسیر مدارک یا تفسیر جلالین یا ان جیسی کوئی اور تفسیر پڑھی ہو۔ کسی عالم سے قرآن کی تحقیق کی ہو۔ اور اس کے معانی حل کیے ہوئے ہوں۔ مشکل الفاظ کو سمجھا ہو۔ اسباب نزول کا احاطہ کیا ہو اور اعراب، قصص اور اس سے جو متعلق مسائل ہیں، ان کا عالم ہو۔ مرشد کے سنت کا عالم ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ حدیث کی "المصابیح" جیسی کتاب

پڑھ چکا ہو۔ اُس نے اس میں تحقیق کی ہو۔ اس کے معانی سمجھا ہو۔ اس کے غریب و نامانوس الفاظ کی شرح کی ہو۔ اس کے مشکل اعراب کو حل کیا ہو اور حدیث میں جو دقیق مسئلہ آیا ہو، فقہا میں سے کسی ایک کی رائے کے مطابق اُس نے اس کی تاویل و تشریح کی ہو۔ مرشد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کا حافظ ہی ہو۔ اور نہ یہ لازمی ہے کہ اس نے احادیث کی اسانید میں بڑی کرید کی ہو۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ تابعین اور تبع تابعین منقطع اور مرسل حدیث بھی لے لیتے تھے ہاں اس ضمن میں اصل مقصود صرف اتنا ہے کہ اس امر کا حتی الامکان اُسے ظن غالب ہو جائے کہ اس حدیث کا سلسلۂ روایت، رسول اللہ صلی علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔

نیز مرشد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصول فقہ، علم کلام، فقہ کی جزئیات اور اُن کے فتاوی کا عالم ہو۔ ہم نے بیعت لینے والے کے لیے علم کی شرط صرف اس لیے لگائی ہے کہ بیعت سے اصل غرض امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تسکین باطن کے حصول کی تلقین اور بُرائیوں کو دور کرنے اور اچھائیوں کے حاصل کرنے کی ترغیب و ارشاد ہے۔ اور چونکہ بیعت کرنے والے مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تمام باتوں میں اپنے مرشد کی اطاعت کرے۔ اس لیے اگر مرشد عالم نہیں تو اُس سے ان اُمور کو سرانجام دینے کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔؟

تمام مشائخ اس امر میں متفق ہیں کہ جس شخص نے حدیثیں نہ لکھی ہوں اور قرآن نہ پڑھا ہو، وہ کبھی عنا اُٹھ کیسے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص ایک مدت تک متقی علما کی صحبت میں بیٹھا ہو۔ اُن سے اُس نے تربیت حاصل کی ہو۔ وہ حلال و حرام میں خوب پہچان کرنے والا ہو۔ اور کتاب اللہ اور سنت رسول

سے اچھی طرح واقف ہو، تو البتہ یہ چیزیں وغد کہنے کے لیے کافی ہو سکتی ہیں باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ مرشد کے لیے دوسری شرط اس کا عادل ہونا اور اُس کا تقویٰ ہے۔ مرشد کو چاہیئے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچے۔ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرے۔ اور اُس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ وہ دنیا سے بے نیاز ہو۔ آخرت میں رغبت رکھتا ہو۔ جو طاعات و عبادات ضروری اور مؤکد ہیں۔ اور جو ذکر و اذکار صحیح احادیث میں مروی ہیں۔ ان کا پابند ہو۔ اور اس کا دل برابر اللہ سبحانہ سے تعلق رکھے اور اُس کے لیے "یاد داشت[1]" ایک مستقل ملکہ بن جائے۔

مرشد کے لیے چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عامل ہو۔ اپنی رائے میں پختہ ہو۔ مذبذب الخیال کا نہ ہو کہ نہ اُس کی اپنی رائے ہو اور نہ اُس کا اپنا کوئی فیصلہ۔ نیز مرشد کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحب مروت ہو۔ اور عقل تام رکھتا ہو تاکہ جس چیز کے کرنے کو وہ کہے اور جس سے وہ منع کرے، اس میں اس پر پورا اعتماد کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے "گواہی اُن کی مقبول ہے، جن گواہوں کو تم پسند کرو"۔ جب گواہوں کے معاملے میں یہ حال ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ بیعت لینے والے مرشد کے لیے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ اس میں عدالت اور تقویٰ ہو تاکہ مرید اس پر اعتماد کر سکے۔

مرشد کے لیے پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ ایک مدتِ دراز تک مشائخ کی صحبت میں رہا ہو۔ اور ان سے اُس نے تربیت پائی اور نورِ باطن اور تسکینِ قلب اخذ کی ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ایک بندھا

---

[1] یاد داشت مقاماتِ سلوک میں سے ایک مقام ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی؛

ہوا نظام ہے کہ کوئی شخص فلاح نہیں پا سکتا جب تک وہ فلاح پانے والوں کو نہ دیکھے بھالے اور اُن سے نہ ملے جُلے۔ جس طرح کہ کوئی شخص علم حاصل نہیں کر سکتا، جب تک کہ وہ علما کی صحبت میں نہ رہے۔ یہی دوسرے پیشوں میں بھی ہوتا ہے۔ نیز مُرشد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے کرامات، اور خوارق ہی ظاہر ہوں۔ یا وہ کسب معاش کو چھوڑ بیٹھے۔ کرامات اور خوارق تو ثمرہ ہوتے ہیں محض مجاہدات اور ریاضتوں کا۔ اور یہ چیز شرطِ کمال نہیں ہے۔ اسی طرح کسبِ معاش کو چھوڑ بیٹھنا شریعت کے منافی ہے۔ اس ضمن میں اُن لوگوں کے اعمال سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، جو مغلوب الاحوال ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں سلف سے جو طریقہ چلا آتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو بھی تھوڑا سا مل جائے، اُس پر قناعت کر لی جائے۔ اور جو شبہے کی چیزیں ہیں، اُن سے بچا جائے۔

باقی رہا یہ سوال کہ بیعت کرنے والے مرید کے لیے کیا کیا شرطیں ہیں، تو اِس بارے میں تمہیں جاننا چاہیے کہ بیعت کرنے والے مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالغ عاقل ہو، شوق و رغبت رکھنے والا ہو۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک بچہ پیش کیا گیا کہ وہ آپؐ سے بیعت کرے۔ آپؐ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس کے لیے برکت کی دعا کی۔ اور اس سے بیعت نہ لی۔ بعض مشائخ تبرک اور نیک فالی کے خیال سے کم عمروں کی بیعت بھی جائز قرار دیتے ہیں۔

اس بحث کا پانچواں مسئلہ کہ بیعت کو توڑنے اور اُس کو پورا کرنے سے کیا مراد ہے؟ اِس کے متعلق تمہیں جاننا چاہیے کہ بیعت جو صوفیا میں نسلاً بعد نسل چلی آتی ہے، اس کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک گناہوں سے توبہ کرنے کی بیعت ہوتی ہے۔ ایک بیعت صالحین کے سلسلہ میں تبرک کے طور پر شریک ہونے

کی ہے جیسے کہ احادیث کے راویوں میں تبرک کے خیال سے شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔ صوفیا کی بیعت کی تیسری قسم یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے لیے سب سے کنارہ کش ہونے، جن چیزوں سے اللہ نے منع کیا ہے، اُن کو ظاہراً و باطناً ترک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل کو وابستہ کرنے پر عزم بالجزم کیا جائے اور اس کے لیے بیعت ہو۔

بیعت کی پہلی جو دو شکلیں ہیں، ان کو پورا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ کبیرہ گناہوں سے بچا جائے۔ صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ ہو۔ اور طاعات و عبادات میں جو واجب ہیں یا جو چیزیں سنتِ مؤکدہ کا درجہ رکھتی ہیں، ان کی پابندی کی جائے۔ یہ تو ہوا بیعت کا ایفائے عہد۔ باقی رہا اُس کا توڑنا۔ سو اوپر کے اعمال بجا نہ لانا۔ یہ نقضِ بیعت ہوگا۔ اس نوع کی بیعت کی تیسری شکل کا ایفا یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کے لیے دنیا سے کنارہ کشی کے عزم اور اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچنے کی سعی و کوشش پر مُرید برابر قائم رہے۔ یہاں تک وہ سکینۂ قلب کے نور سے منور ہو جائے۔ اور یہ نور اُس کے اندر بطور ایک عادت، خُلق اور طبیعت کے ہو جائے۔ جب مُرید اپنے اندر یہ حالت پیدا کر لے تو اُس وقت اُسے اُن چیزوں کے کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے جو شریعت نے مباح قرار دی ہیں۔ وہ دنیاوی لذات سے مستفید ہو سکتا ہے اور اس قسم کے مشاغل جیسے تعلیم دینا اور قضا کا منصب ہے، یا جن میں ایک لمبے عرصے تک مصروف رہنا پڑتا ہے، وہ کر سکتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کے عزم اور اللہ تعالیٰ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچنے کی سعی پر برابر قائم نہ رہنا بہ اس بیعت کی خلاف ورزی اور عہد شکنی ہوگی۔

چھٹے سوال کے متعلق کہ کیا ایک یا ایک سے زیادہ عالموں سے ایک

شخص کا ایک سے زیادہ بیعت کرنا جائز ہے یا نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے بار بار بیعت لی۔ اِسی طرح صوفیا کا بھی کئی بار بیعت لینا مذکور ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ ایک سے بیعت کرنے کے بعد پھر دوسرے سے بیعت کی جائے یا نہ کی جائے تو اس کی صورت یہ ہے کہ جس مُرشد سے کہ پہلے بیعت کی ہے، اگر اس میں کوئی خلل ظاہر ہو تو دوسرے مُرشد سے بیعت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح پہلے مرشد کی موت اور اُس کے لاپتہ ہونے پر بھی دوسرے مُرشد سے بیعت کی جا سکتی ہے۔ لیکن پہلی بیعت کو چھوڑ کر دوسرے مُرشد سے بغیر کسی عذر کے بیعت کرنا، یہ تو ایک کھیل ہے۔ اِس سے یہ ہوگا۔ کہ بیعت میں برکت نہ رہے گی اور مُرشدوں کا دل مرید کی خبر گیری سے ہٹ جائے گا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اور یہ سوال کہ بیعت کے کون سے الفاظ سلف سے منقول ہیں۔ اس کے متعلق تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بیعت لیتے وقت، مُرشد کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے خطبہ مسنونہ پڑھے۔ اور وہ یہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

اِس خطبہ مسنونہ کے بعد مرشد مرید کو ایمان اجمالی کی تلقین کرے۔ اور اس سے یوں کہلوائے "میں ایمان لایا اللہ پر اور جو اللہ کی طرف سے آیا اللہ کی مراد پر۔ میں ایمان لایا اللہ کے رسول پر اور جو کچھ اللہ کے رسول سے اللہ کے رسول کی مراد پر۔ میں نے تمام مذاہب اور تمام گناہوں سے برأت کی، اور اس

وقت اور اب اسلام لایا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں"۔

اِس کے بعد مُرشد مُرید سے کہے کہ یوں کہہ "میں بیعت کرتا ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپؐ کے خلفا کے توسط سے ان پانچ چیزوں پر (۱) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے رسول ہیں (۲) نماز کا قیام (۳) ادائے زکوٰۃ (۴) رمضان کے روزے (۵) زاد راہ کی استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج"۔ پھر مُرید سے یوں کہلوائے۔ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آپؐ کے خلفا کے واسطے سے اِس بات پر بیعت کرتا ہوں کہ میں اللہ کے ساتھ شرک نہیں کروں گا۔ نہ چوری کروں گا نہ زنا۔ نہ کسی پر جھوٹا بہتان لگاؤں گا اور نیک کاموں میں اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا"۔ اِس کے بعد مُرشد یہ دو آیتیں تلاوت کرے۔ یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عَاھَدَ عَلَیْہِ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ پھر مُرشد اپنے لیے، مُرید کے لیے اور جو حاضرین ہوں، ان کے لیے دعائے خیر کرے اور پھر کہے "اللہ تعالیٰ برکت دے ہمیں اور تم کو اور نفع دے ہمیں اور تم لوگوں کو"۔

بیعت لیتے وقت اگر مُرشد، مُرید سے یہ کہلوائے "میں نے نقشبندی طریقہ جو شیخ اعظم قطب افخم خواجہ نقشبند کی طرف یا قادری طریقہ جو شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی طرف یا چشتی طریقہ جو معین الدین سجزی کی طرف منسوب ہے اختیار کیا۔ اے اللہ! ہمیں اس طریقہ

کی فتوح عطا فرما۔ اور تو اپنی رحمت سے اس طریقے کے زمرۂ اولیا میں ہمیں شامل کر۔ اے سب سے زیادہ رحمت کرنے والے"۔ تو اس طرح کہلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

میرے والد شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں :" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ کی میں نے بیعت کی اور آپؐ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ چنانچہ اب میں جب کسی سے بیعت لیتا ہوں تو اسی طرح اُس کے ہاتھ کا مصافحہ کرتا ہوں"۔ عورتوں سے بیعت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ مُرشد کپڑے کا ایک کنارہ پکڑے، اور جو عورت بیعت کرنا چاہتی ہو، وہ اس کا دوسرا کنارہ پکڑ لے۔ باقی خُدا بہتر جانتا ہے۔

تیسری فصل

مُرید کی تعلیم و تربیت

سالکوں کی تربیت کے مختلف درجے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے، وہ سالک کا عقیدہ ہے۔ جب مرید اللہ کے راستے پر چلنے کی طرف راغب ہو، تو مُرشد اُس کو حکم دے کہ سب سے پہلے وہ سلف صالحین کے مطابق اپنے عقائد کی تصحیح کرے۔ یعنی وہ ذاتِ واجب الوجود کو اس طرح مانے کہ کوئی معبود نہیں ہے اس کے سوا۔ اور حیات، علم، قدرت، ارادہ اور اس طرح کی اور جو صفات ہیں، ان سب کا جو درجۂ کمال ہے، وہ ذاتِ واجب الوجود ان سے متصف ہے۔ مُرید اللہ کے لیے ان صفاتِ کمال کو اسی طرح مانے، جس طرح خود اللہ نے انہیں اپنی کتاب میں ثابت کیا ہے۔ اور جس طرح صحیح احادیث و روایات سے یہ صفاتِ الٰہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، جو صحیح خبر دینے والے ہیں،

اور آپؐ کی آل، آپؐ کے اصحابؓ اور آپؐ کے تابعین سے ثابت ہیں۔ نیز وہ ذات واجب الوجود کو نقص و زوال کے ان تمام عیوب سے جیسے کہ جسمیت، کسی خاص جگہ میں محدود ہونا، عرض ہونا، کسی خاص طرف کسی خاص رنگ اور کسی خاص شکل سے متصف ہونا وغیرہ ہیں، منزہ مانے۔

صفاتِ الٰہی کے ضمن میں قرآن میں ذاتِ واجب الوجود کے متعلق استوار علی العرش، ضحک یعنی ہنسی اور اثباتِ ید یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں۔ اس طرح کی جو چیزیں وارد ہوئی ہیں۔ ہم مجملاً ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی تفصیل ہم اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اتنا ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ اس ذات کا اپنے آپ کو استوار علی العرش سے متصف[1] کرنا اس طرح نہیں، جس طرح کہ ہم کسی کو اس صفت سے متصف کریں۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے جیسے کہ قرآنِ مجید میں وارد ہوا ہے لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا "استوار علی العرش" ہونا خود اپنی محکم کتاب میں ثابت کیا ہے۔ اس لیے ہم اس کا "استوار علی العرش" ہونا مانتے ہیں۔

ذاتِ واجب الوجود کو اس طرح ماننے کے بعد مرید کو چاہیے کہ وہ تمام انبیا کی نبوت کا بالعموم اور سیدنا و مولانا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا بالخصوص یقین و اثبات کرے۔ آپؐ نے خدا کی طرف سے جو کرنے کا حکم دیا ہے اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سب میں آپؐ کی اتباع

---

[1] استوار علی العرش کے متعلق امام مالک فرماتے ہیں۔ استوار علی العرش معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے۔ اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔

کو واجب سمجھے۔ اور آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی صفات جس طرح بیان فرمائی ہیں اور موت کے بعد دوسری زندگی میں انسانوں کا جسموں کے ساتھ زندہ ہونا۔ جنت، دوزخ، حشر، حساب، رویت الٰہی، قیامت، عذاب قبر اور اس طرح کی اَور چیزیں جو روایات سے ثابت ہیں، اور صحیح احادیث میں اُن کا ذکر آیا ہے۔ مُرید ان سب باتوں کی تصدیق کرے۔

تصحیحِ عقائد اور اثباتِ نبوت کے بعد مُرید کو کبیرہ گناہوں سے بچنے اور صغیرہ گناہوں کے ارتکاب پر نادم ہونے کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ کبیرہ گناہوں کی حقیقت یہ ہے کہ وہ گناہ جن کے متعلق قرآن اور اُن صحیح احادیث میں جو کہ علمائے احادیث کے نزدیک معروف و مشہور ہیں، دوزخ اور سخت عذاب کی وعید دی گئی ہے یا اس کے مرتکب کو کافر بتایا گیا ہے، گناہ کبیرہ ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی وہ کافر ہوا"۔ یا آپؐ کا یہ ارشاد: "ہمارے اور مشرکین کے درمیان اگر کوئی فرق کرنے والی چیز ہے تو وہ نماز ہے۔ چنانچہ جس نے نماز کو ترک کیا وہ کافر ہو گیا"۔ نیز وہ گناہ جن کے ارتکاب پر شریعت کی طرف سے حد مقرر ہے، جیسے زنا، چوری، رہزنی، شراب پینا، یا ان کی طرح کے اَور گناہ، جن کو عقل صریح طور سے بُرائی میں مذکورہ بالا گناہوں کے مساوی یا ان سے بڑھا ہوا سمجھے، یہ سب کے سب کبیرہ گناہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی اَور کو شریک کرنا اور رزق، شفا اور اسی طرح کے اَور کاموں میں اللہ کے سوا اَوروں سے مدد مانگنا، ان کا شمار بھی کبیرہ گناہوں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ کی آیت "اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ" میں اسی شرک فی العبادت اور شرک فی الاستعانت سے برأت کا اظہار کیا گیا ہے۔

کبیرہ گناہوں میں سے ایک کاہن کی بات کی تصدیق کرنا بھی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قرآنِ مجید اور فرشتوں کو گالی دینا۔ ان کا انکار کرنا۔ ان کا مذاق اُڑانا اور ضروریاتِ دین کا انکار کرنا۔ نیز نماز کو ترک کرنا۔ زکوٰۃ نہ دینا۔ روزے نہ رکھنا۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا۔ بغیر وجۂ حق کے کسی کو مار ڈالنا۔ اولاد کو قتل کرنا۔ خود اپنی جان لینا۔ زنا، لواطت۔ نشے والی چیز پینا۔ چوری۔ رہزنی۔ کسی کا مال غصب کر لینا۔ خیانت کرنا۔ جھوٹی شہادت دینا۔ جھوٹی قسم کھانا۔ پاک دامن عورت پر بہتان لگانا۔ یتیم کا مال کھانا۔ والدین کی نافرمانی کرنا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرنا۔ ناپ اور تول میں بے ایمانی کرنا۔ جہاد میں میدانِ جنگ سے بھاگ جانا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا۔ رشوت لینا۔ جن سے نکاح حرام ہے، اُن سے نکاح کرنا۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان کُٹناپن کرنا۔ حاکم سے لوگوں کی چغلی کھانا تاکہ وہ اُنہیں قتل کرے۔ یا اُن کا مال لُوٹ لے۔ دار الحرب سے ہجرت نہ کرنا۔ کفار سے موالات کرنا۔ جوا کھیلنا، جادو کرنا۔ یہ سب گناہِ کبیرہ ہیں۔

صغیرہ گناہ یہ ہیں :- اول وہ کام جن سے شریعت نے روک دیا ہے۔ دوسرے ایسے کام جن سے شریعت کے مقرر کیے ہوئے احکام کی مخالفت ہوتی ہو۔ یا پھر ایسے امور کہ ان کے کرنے سے دین کے طریقے بے اثر ہوتے ہیں۔

تصحیحِ عقائد، اثباتِ نبوت، کبیرہ گناہوں سے اجتناب اور صغیرہ گناہوں پر ندامت کے بعد مُرید کو ارکانِ اسلام کی بجا آوری پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ادا کرے۔ اور وہ اِس طرح کہ ان کے واجبات، آداب، ان کی ہیئات اور اذکار کو ٹھیک طرح سر انجام دے۔ اِس کے بعد مُرید کو

چاہیے کہ زندگی کی معاشی ضروریات یعنی اکل وشرب، بات چیت اور لوگوں سے ملنے جلنے نیز خانگی معاملات یعنی نکاح، غلاموں اور اولاد کے حقوق اور پھر خرید وفروخت، ہبہ اور اجارہ وغیرہ امور پر توجہ کرے۔ اور اُن کو بغیر کسی رُو رعایت اور کج روی کے سُنت کے مطابق ادا کرے۔

معاشی اور گھریلو زندگی کی ضروریات کے بعد مُرید کو اُن اذکار پر نگاہ رکھنی چاہیے جو صبح وشام اور سونے کے وقت وغیرہ کے لیے مقرر ہیں پھر اُسے ریا کاری، غرور، حسد اور کینہ سے اپنے اخلاق پاک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نیز اُسے تلاوتِ قرآن اور آخرت کے ذکر کو برابر کرتے رہنا چاہیے۔ اُسے چاہیے کہ وہ علم کی مجالس، ذکر واذکار کے حلقوں اور مساجد میں برابر حاضر ہو۔ جب مرید اِن آداب اور اعمال میں راسخ ہو جائے تو پھر اس کے لیے باطنی اشغال کرنے کا وقت آتا ہے۔ اِس سلسلے میں اُسے چاہیے کہ وہ دل کو اللہ کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کرے اور اپنے دل کی نظریں برابر اُسی کی طرف لگائے رکھے۔ ان تمہیدی امور کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں بیان نہیں کرتے۔ اور طالب صادق کے فہم پر اعتماد کرتے ہیں کہ وہ کتاب، سنت، فقہ، تصوف وسلوک کی درمیانی درجے کی کتابوں جیسے "ریاض الصالحین" اور عقائد کی مختصر کتابوں جیسے "عقائد عضدیہ" میں ان کو خود دیکھ لے گا جو شخص خود ان کتابوں کو نہ دیکھ سکے، اسے چاہیے کہ وہ کسی عالم سے ان امور کو دریافت کرے۔

قادری مشائخ کے اشغال

قادری مشائخ امام الطریقت شیخ ابو محمد محی الدین عبد القادر جیلانی (اللہ ان سے اور اُن کے تمام تابعین سے راضی ہو) کے اصحاب ہیں۔ یہ مشائخ سب سے پہلے مُرید کو ذکرِ جہر کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جہر میں افراط نہ ہو۔ یعنی بہت زیادہ بلند آواز میں ذکر نہ کیا جائے۔ اِس طرح کے ذکرِ جہر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی مخالفت نہیں ہوتی، جس میں آپؐ فرماتے ہیں "اعتدال سے کام لو۔ اور اللہ کو زور زور سے نہ بلاؤ۔ بے شک تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں بُلا رہے ہو"۔ یہ ذکرِ جہر اسمِ ذات یعنی اللہ کا ہوتا ہے۔ یہ ذکر یا تو ایک ضربی ہو۔ اور ایک ضربی ذکر کا مطلب یہ ہے کہ مُرید لفظ اللہ کو شد، مد، دل اور حلق کی تمام قوت کے ساتھ زور سے کہے۔ اور پھر ذرا دم لے تاکہ اُس کا سانس ٹھیک ہو جائے۔ اس کے بعد پھر اُسی طرح اللہ کہے اور برابر کہتا جائے۔ یا پھر یہ ذکر دو ضربی ہوتا ہے۔ دو ضربی ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ ذکر کرنے والا ویسے بیٹھے جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں۔ اور "اللہ" کی ایک بار دائیں زانو میں اور دوسری بار دل میں ضرب لگائے۔ اور اس طرح بار بار بغیر فصل کے کرے۔ دو ضربی ذکر میں مناسب یہ ہے کہ ذکر کرتے وقت ضرب اور خاص طور پر وہ ضرب جو دل پر لگے، پوری قوت اور شدت کی ہو تاکہ اس کا اثر دل پر پڑے اور اس طرح طبیعت یک سو ہو جائے۔

ذکرِ جہر سہ ضربی بھی ہوتا ہے۔ سہ ضربی ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر چار زانو بیٹھے۔ اور ایک بار دائیں زانو میں، دوسری بار بائیں زانو میں اور تیسری بار دل پر

ضرب لگائے۔ لیکن تیسری ضرب سب سے سخت اور بلند تر ہو۔ یا یہ ذکر چار ضربی ہو۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر چار زانو بیٹھے۔ ایک بار وہ دائیں زانو میں ضرب لگائے۔ دوسری بار بائیں زانو میں۔ تیسری بار دل پہ۔ چوتھی بار اپنے سامنے ضرب لگائے۔ لیکن چوتھی ضرب سخت تر اور بلند تر ہونی چاہیے۔

ذکر جہر میں نفی یعنی "لا الٰہ" اور اثبات یعنی "الا اللہ" کا ذکر بھی ہے اُس کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر نماز کی نشست بیٹھے۔ اُس کا مُنہ قبلہ کی طرف ہو۔ وہ آنکھیں بند کر کے کہے "لا"۔ وہ "لا" اس طرح کہے۔ گویا کہ اس کلمہ "لا" کو ناف سے نکال رہا ہے۔ وہ "لا" کو اتنا کھینچے کہ وہ دائیں مونڈھے تک پہنچ جائے۔ پھر الٰہ کو اس طرح کہے گویا اس کو دماغ کی جھلی سے نکال رہا ہے۔ پھر "الا اللہ" کی پورے زور اور قوت سے ضرب لگائے۔ جب وہ "لا الٰہ" کہے تو گویا اللہ کے سوا ہر محبوب، ہر مقصود اور ہر وجود کی نفی کر دے۔ اور "الا اللہ" میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے یہ تینوں اوصاف کا اثبات کرے۔

شائد تم مجھ سے یہ پوچھو کہ آخر ذکر میں اس طرح ضربیں لگانے، زور زور سے ذکر کرنے اور ذکر میں دائیں زانو اور بائیں زانو اور قلب کی رعایت کرنے کی شرطوں میں کیا حکمت ہے؟ سو بات یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے انسان کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ وہ اِدھر اُدھر توجہ کرنے اور نغموں اور سرود کے اتار چڑھاؤ کی طرف کان لگانے پر مجبور ہے۔ نیز اُس کے دل میں طرح طرح کی باتیں اور خیالات برابر چکر لگاتے رہتے ہیں۔ مشائخ نے ذکر میں یہ طریقہ اس لیے وضع کیا ہے کہ اس سے ذاکر کی توجہ اپنے سوا کسی اور طرف نہیں جاتی۔ اور باہر کے خیالات اُس کے دل میں نہیں آپاتے۔ اِس طرح ذکر کرنے سے شروع میں ذاکر کی توجہ سب طرف سے ہٹ کر اپنے نفس پر مرکوز ہوتی ہے۔ پھر بتدریج اپنے نفس سے ہٹ کر اس کی توجہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے مخصوص

ہو جاتی ہے۔ سالکوں کو چاہیے کہ نماز فجر و عصر کے بعد حلقۂ ذکر بنائیں۔ مل کر ذکر کرنے میں بڑے فوائد ہیں، جو اکیلے تنہائی میں حاصل نہیں ہوتے۔

کچھ عرصہ ذکر جلی کرنے کے بعد جب سالک پر اس کے آثار ظاہر ہونے لگیں۔ اور اس کو اپنے اندر ذکر کا نور دکھائی دینے لگے تو اسے ذکر خفی کی تلقین کرنی چاہیے۔ ذاکر میں ذکر جلی کے آثار ظاہر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں شوق و رغبت پیدا ہو جائے۔ اللہ کے نام سے اُس کے دل کو اطمینان ہو۔ اِدھر اُدھر کے خیالات اس سے دور ہو جائیں۔ اور اللہ کے سوا جتنی بھی چیزیں ہیں۔ ان سب پر وہ اللہ کو مقدم سمجھنے لگے۔ جو شخص ان شرطوں کے ساتھ جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں، ایک دن اور رات میں اسم ذات یعنی "اللہ" کا چار ہزار بار ذکر کرے۔ اور دو ماہ یا اس کے لگ بھگ۔ مدت تک برابر ذکر کرتا رہے تو یقیناً اُس کے اندر ذکر کے یہ آثار دکھائی دینے لگیں گے خواہ وہ کتنا ہی کند ذہن یا ذکی ہو۔

ذکر خفی میں "اسم ذات" کا اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات کے ساتھ ذکر ہوتا ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ ذاکر اپنی آنکھیں بند کر لے اور ہونٹوں کو کھینچ لے اور دل کی زبان سے کہے اَللّٰہُ سَمِیْعٌ۔ اَللّٰہُ بَصِیْرٌ۔ اَللّٰہُ عَلِیْمٌ۔ ذاکر ان کلمات کو اس طرح کہے گویا کہ وہ ان کو اپنی ناف سے سینے کی طرف کھینچتا ہے اور سینے سے دماغ کی طرف اور دماغ سے عرش کی طرف ان کلمات کو پہنچا رہا ہے۔ اس کے بعد ذاکر اَللّٰہُ عَلِیْمٌ۔ اَللّٰہُ بَصِیْرٌ۔ اَللّٰہُ سَمِیْعٌ۔ اس طرح کہے گویا جس طرح اُس نے ناف سے سینے، سینے سے دماغ اور دماغ سے عرش کی طرف ان کلمات کو اُوپر کھینچا تھا اب اُسی طرح وہ عرش سے دماغ، دماغ سے سینے اور سینے سے ناف کی طرف نیچے کھینچے۔ یہ ذکر خفی کا ایک دورہ ہوا۔ ذاکر اس طرح بار بار کرے۔ اس طریقے کے بعض لوگ اَللّٰہُ عَلِیْمٌ۔ اَللّٰہُ بَصِیْرٌ۔ اَللّٰہُ سَمِیْعٌ کے ساتھ اَللّٰہُ قَدِیْرٌ کا بھی اضافہ کر لیتے ہیں۔

ذکر خفی میں نفی "لَا اِلٰہَ" اور اثبات یعنی "اِلَّا اللّٰہُ" کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ اس

کا طریقہ۔ یا تو وہ ہے جو ہم نے ذکرِ جہر کا بیان کیا ہے۔ یا اس کی یہ شکل ہوگی کہ ذاکر کا دل بیدار ہو اور وہ پوری طرح اپنے تنفس پہ نظر رکھتا ہو۔ چنانچہ جب سانس بغیر کسی قصد و ارادہ کے خود بخود اپنی طبیعت کے مطابق باہر نکلے تو ذاکر سانس کے ساتھ دل کی زبان سے "لا الٰہ" کہے اور جب سانس اندر جائے تو "الا اللہ" زبانِ قلب سے کہے۔ بزرگانِ طریقت فرماتے ہیں کہ یہ "پاسِ انفاس" ہے۔ اِدھر اُدھر کے خیالات کو دور کرنے اور دل کے وسوسوں کو ختم کرنے میں یہ "پاسِ انفاس" بڑا موثر ہوتا ہے۔ جب ذکرِ خفی کا اثر ظاہر ہو اور ذاکر میں اس کا نور دکھائی دینے لگے تو اس کو مراقبہ کی تلقین کرنی چاہیے۔ ذاکر میں ذکرِ خفی کے اثر کے ظاہر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اندر شوق پیدا ہو۔ محبت کا غلبہ ہو۔ فکر کی طرف اس کا عزم و ارادہ پوری طرح مائل ہو جائے۔ وہ سب چیزوں پر اللہ تعالیٰ کو مقدم سمجھے۔ اپنے نصب العین کے لیے اس کی ہمت مضبوط ہو جائے۔ سکوت میں اُسے حلاوت ملے اور بات چیت اور دنیا کے دھندوں سے اُسے نفرت ہو جائے۔

باقی رہا مراقبہ۔ تو بزرگانِ طریقت کے ہاں مراقبے کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن ان سب میں یہ بات ضرور مشترک ہے کہ ذاکر زبان سے ایک آیت یا کلمہ ادا کرے۔ پھر اُس آیت اور کلمے کا دل میں خیال کرے اور اس کا مفہوم اچھی طرح سے اپنے ذہن نشین کرے۔ پھر وہ اس آیت اور کلمے کے مفہوم کے بارے میں سوچے کہ اس کے تصور کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی توجہ اس تصورِ معنوی پر اس طرح لگا دے کہ اس تصور کے سوا کوئی اور خیال اس کے پاس نہ آئے۔ اُسے اس میں پورا استغراق حاصل ہو اور وہ اس تصور کے سوا ہر خیال اور ہر فکر سے ایک حد تک بالکل غافل ہو جائے۔ جہاں تک مراقبے کی اصل کا تعلق ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے جس میں آپ فرماتے ہیں کہ "احسان" یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرے گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اُسے دیکھ نہیں سکتا تو یوں

سمجھے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

سالک جب مراقبے میں ہو تو وہ زبان سے کہے اَللّٰہُ حَاضِرِیْ۔ اَللّٰہُ نَاظِرِیْ اَللّٰہُ مَعِیْ۔ یا بجائے زبان سے ادا کرنے کے صرف دل میں حقیقت کا خیال کرے پھر وہ یوں تصور کرے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کے روبرو موجود ہے وہ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ اس کے ساتھ ہے۔ وہ ان حقائق کا خوب اچھی طرح سے تصور کرے۔ لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اس تصور میں وہ اللہ تعالیٰ کو کسی خاص جہت اور کسی جگہ میں متعین نہ کرے۔ بلکہ اُسے جہت اور مقام سے منزہ سمجھے۔ یا ذاکر قرآن مجید کی اس آیت هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ، پر اپنا خیال جمائے۔ کھڑے، بیٹھے، لیٹے خلوت میں، کام کرتے ہوئے اور فرصت میں یوں تصور کرے گویا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔ یا وہ آیت اَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ یا آیت اَوَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى یا آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ یا آیت وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ یا آیت اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ یا آیت هُوَ الْاَوَّلُ هُوَ الْاٰخِرُ وَهُوَ الظَّاهِرُ پڑھے۔ اور ان کا مراقبہ کرے اوپر کی آیات کے یہ سب مراقبے اللہ کے ساتھ دل کا تعلق قائم کرنے کے لیے بہت مفید ہیں۔ دنیا کے علائق سے قطع تعلق کرنے، پوری طرح یکسو ہونے، سُکر یعنی بے ہوشی اور محویت کے لیے آیت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ کا مراقبہ مفید ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ذاکر اپنے آپ کو یوں تصور کرے گویا کہ وہ مر گیا اور مر کر راکھ بن گیا۔ ہوائیں اس کی راکھ کو اُڑا رہی ہیں آسمان پھٹ گیا ہے۔ اور ہر چیز اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی ہے کہ اس کی اپنی کوئی ترکیب باقی ہے اور نہ ہیئت۔ اس حالت میں ذاکر اس بات کا تصور کرے کہ صرف ایک اللہ ہی ہے اور کچھ دیر تک وہ اس تصور پر قائم رہے۔ الغرض یہ مراقبہ محویت کے لیے بڑا مفید ہے۔ اسی طرح اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ کا مراقبہ بھی محویت کے لیے

مفید ہے۔ چنانچہ مراقبے کا اثر ذاکر میں ظاہر ہو جائے اور اس کا نور اس میں دکھائی دینے لگے تو پھر مُرشد کو چاہیئے کہ سالک کو توحیدِ افعالی[1] کی تلقین کرے۔

اس ضمن میں تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ دو چیزیں ہیں جن کی شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ترغیب دی اور ان کے کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ایک ذکر اور دوسری فکر۔ ذکر زبان سے ہوتا ہے اور فکر سے مراد یہی مراقبہ ہے بعض مشائخ کا بیان ہے کہ ہم نے واقعات آئندہ معلوم کرنے کے لیے جس طریقے کا تجزیہ کیا ہے، وہ یہ ہے طالب خلوت میں بیٹھے، غسل کرے، اچھا لباس پہنے۔ خوشبو لگائے۔ مصلّے پر بیٹھے۔ ایک مصحف کھول کر اپنے دائیں رکھے۔ ایک کھلا مصحف اپنے بائیں۔ ایک اپنے سامنے اور ایک کھلا مصحف اپنے پیچھے۔ پھر اپنی پوری توجہ اور اپنی ساری ہمت سے خدا تعالیٰ سے دعا کرے کہ وہ فلاں ہونے والے واقعہ کو اس کے لیے منکشف کر دے۔ پھر وہ آنکھیں بند کرے اور "اسم ذات" کا ذکر شروع کر دے۔ ایک ضرب وہ اپنی طرف کے مصحف میں لگائے۔ ایک ضرب بائیں مصحف میں۔ ایک ضرب اپنے سامنے والے مصحف میں اور ایک اپنے پیچھے والے مصحف میں۔ یہ ضربیں وہ برابر لگاتا جائے یہاں تک کہ وہ اپنے اندر کشادگی اور نور محسوس کرنے لگے۔ وہ ایک ہفتہ تک برابر اس طرح ذکر کرے اور خلوت میں بیٹھے۔ اس سے لامحالہ اس پر واقعاتِ آئندہ کا انکشاف ہو جائے گا۔ گو یہ طریقہ مشائخ سے اس طرح نقل کیا گیا ہے۔ لیکن میرے دل میں اس طریقے سے کچھ کراہت سی ہے، کیونکہ اس میں میرے نزدیک قرآن مجید کی بے حرمتی ہے۔ میرے والد نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار فرمایا، وہ یہ ہے:۔ طالب اللہ تعالیٰ کے اسماء یَا عَلِیْمُ، یَا مُبِیْنُ، یَا خَبِیْرُ کا ذکر کرے۔ اس میں اُوپر جو ذکر کی شرطیں بیان کی جا چکی ہیں، اُن کو ملحوظ رکھے۔ اِس ضمن میں یا تو وہ یک ضربی ذکر کرے یا سہ ضربی باقی ان معاملات کو اللہ بہتر جانتا ہے۔

---

[1] توحید افعالی کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اُسے اللہ کی طرف سے سمجھے۔ مترجم

قادری مشائخ کا کہنا ہے کہ ہم نے کشفِ ارواح کے لیے مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ ذکر کے اس طریقے کو آزمایا ہے کہ ذاکر دائیں جانب سُبُّوحٌ کی ضرب لگائے۔ بائیں جانب قُدُّوسٌ کی۔ آسمان کی طرف رَبُّ الْمَلٰٓئِکَۃِ کی اور دل میں الرُّوْحِ کی۔ اور اگر کوئی اہم اور مشکل معاملہ پیش آجائے تو طالب اُوپر کی شروط کے ساتھ یہ کرے کہ رات کو وہ جہاں تک زیادہ سے زیادہ نماز پڑھ سکے، نماز پڑھے پھر اپنے دائیں یَا حَیُّ کی ضرب لگائے اور بائیں جانب یَا وَھَّابُ کی۔ چنانچہ اس طرح وہ ایک ہزار بار کرے۔ انشراحِ خاطر اور بلاؤں کو دور کرنے کے لیے طالب کو چاہیے کہ وہ دل میں اَللّٰہُ کی ضرب لگائے۔ اور جیسا کہ ہم ذکر نفی و اثبات کے ذیل میں لکھ آئے ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر کرے۔ پھر دائیں جانب اَلْحَیُّ کی ضرب لگائے۔ اور اپنے بائیں جانب اَلْقَیُّوْمُ کی۔ اگر وہ کسی مریض کی شفا یا بھوک کے تدارک یا رزق میں فراوانی یا دشمن پر غلبہ پانے کے لیے خدا تعالیٰ سے دعا مانگنا چاہتا ہو تو اُسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے وہ نام تلاش کرے جو موقع اور ضرورت کے مناسب ہو۔ وہ اس نام کا دو ضربی، سہ ضربی اور چہار ضربی ذکر کرے۔ مثلاً وہ شفا کے لیے یَا شَافِی، بھوک کے تدارک کے لیے یَا صَمَدُ، رزق کی کشائش کے لیے یَا رَزَّاقُ اور دشمن پر غلبہ پانے کے لیے یَا مُذِلُّ کا ذکر کرے۔

پانچویں فصل

چشتی مشائخ کے اشغال

چشتی مشائخ سلسلۂ چشتیہ کے امام خواجہ معین الدین چشتی کے اصحاب ہیں۔ موصوف موضع چشت کی طرف منسوب ہیں، جو آپ کے بزرگوں کا وطن تھا۔ مشائخ چشتیہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا "یا رسول اللہ! مجھے وہ راستہ بتائیے جو اللہ کی طرف جانے کے لیے سب سے آسان ہے۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خلوت میں برابر ذکر کرتے رہو۔ حضرت علی رضؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! یہ ذکر کیسے کروں؟ آپؐ نے فرمایا۔ اپنی آنکھیں بند کرو، اور جو میں کہتا ہوں سنو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کہا اور حضرت علی آنکھیں بند کیے سنتے رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ چکے تو حضرت علیؓ نے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کو تین بار دہرایا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہے۔ اسی ذکر

کی تلقین حضرت علیؓ نے حسن بصریؒ کو کی تھی۔ اور حسن بصریؒ نے بعد والوں کو اس کی تلقین کی یہاں تک کہ اس کا سلسلہ یہاں تک پہنچا ہے۔ ہم نے یہ حدیث چشتی مشائخ کو روایت کرتے پایا ہے۔ لیکن اگر اس حدیث کو فنِ حدیث کے جاننے والوں کے اصولوں پر جانچا جائے تو اس میں بڑی گفتگو ہو سکتی ہے۔

سلسلۂ چشتیہ میں جب شیخ مُرید کو تلقین کرنا چاہے تو اُسے چاہیئے کہ مُرید کو روزہ رکھنے کا کہے۔ اگر یہ روزہ جمعرات کے دن کا ہو تو بہتر ہے۔ پھر شیخ مرید کو دس بار استغفار کرنے اور دس بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ بھیجنے کا کہے۔ اس کے بعد مُرید کو مُرشد بتائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: "اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے"۔ تمہیں بھی چاہیئے کہ اس امر کی کوشش کرو تم پر کوئی وقت ایسا نہ گزرے جس میں تم اللہ کا ذکر نہ کرو۔ تمہیں جاننا چاہیئے کہ تمہارا دل تمہاری بائیں چھاتی سے دو انگل نیچے صنوبر کی شکل کا ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں ایک اوپر کا ایک نیچے کا۔ مُرید جب ذکر جلی کا ارادہ کرے تو اُسے چاہیئے کہ چار زانو بیٹھے، اور اپنے دائیں پاؤں کے انگوٹھے اور اُس کے ساتھ کی اُنگلی سے اپنی اس رگ کو دبائے جو کیماس کہلاتی ہے۔ میں نے اپنے والد قدس سرہٗ سے سُنا ہے کہ کیماس وہ رگ ہے جو زانو کے نیچے سے ران کی طرف آتی ہے اس کو دبانے سے یہ فائدہ ہے۔ کہ اس سے دل سے وسوسے اور خیالات دور ہو جاتے ہیں۔ طالب کی ہمت یکسو ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے دل میں بڑی گرمی آجاتی ہے۔ طالب کو چاہیئے کہ پھر وہ اپنی نشست بدلے۔ نماز کی بیٹھک بیٹھے۔ اپنا منہ قبلہ کی طرف کرے۔ اپنے عزم و ارادہ کو مجتمع کر کے "لا"

لہ مصنف نے حاشیے میں اس پر یہ اضافہ فرمایا ہے کہ اُوپر کے دروازے سے مطلب دروازہ ہے جو جسم سے متعلق ہے اور نیچے کے دروازہ سے مراد وہ ہے جو روح کی طرف کھلتا ہے۔

کی مدّ اور اِلَّا اللّٰہُ کی شد کی رعایت کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے اور اس میں اپنے دل کی پوری قوت لگا دے۔ وہ "لَا" کے لفظ کو ناف سے نکالے اور اُسے کھینچ کر دائیں بازو تک لے جائے اور "اِلٰہَ" کو دماغ کی جھلی سے نکالے "لَآ" اور "اِلٰہَ" کو اس طرح ادا کرنے میں اشارہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا تمام دوسری چیزوں کی محبت اپنے دل سے نکال کر پیٹھ پیچھے پھینک دی۔ یہ تو ایک سانس میں کہے، اِس کے بعد دوسرا سانس لے اور اِلَّا اللّٰہُ کی ضرب پوری شدت اور قوت کے ساتھ دل پر لگائے۔ لَآ اِلٰہَ کہتے وقت راہِ سلوک کا جو طالب مبتدی ہو، وہ تو اللہ کے سوا ہر معبود کی دل سے نفی کرے۔ جو اس راستے کا متوسط ہو، وہ اللہ کے سوا ہر مقصود کی نفی کرے۔ اور جو اس منزل میں منتہی یعنی آخری درجے پر ہو، وہ اللہ کے سوا ہر وجود کی نفی کرے۔

اِس طریقِ ذکر میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ ایک تو طالب اپنی ساری ہمت یکسو رکھے۔ دوسرے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے وقت وہ اس کا مقصود و مطلب اچھی طرح سے سمجھتا ہو۔ اس ضمن میں جو طالب ذکرِ جلی کر رہا ہو، اُسے چاہیے کہ وہ اپنی خوراک بہت زیادہ کم نہ کرے۔ اُس کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنا چوتھائی معدہ خالی رکھے؛ نیز اُسے ذکرِ جلی کے دوران تر چیزوں کا استعمال ضرور رکھنا چاہیے کہ مبادا کہیں کثرتِ ذکر سے اُس کے دماغ میں خلل نہ آجائے۔ جب طالب اس سلسلۂ ذکر میں "پاس انفاس" پر عامل ہو تو چاہیے کہ اُس کا دل بیدار ہو۔ اور وہ اپنے سانسوں پر پورا نگران ہو۔ جب وہ سانس باہر کی طرف لے تو لَآ اِلٰہَ کہے۔ گویا اُس نے اپنے دل سے اللہ کے سوا ہر چیز کی محبت نکال دی۔ جب سانس اندر جائے تو سانس کے اندر جاتے ہوئے اِلَّا اللّٰہُ کہے۔ گویا کہ اُس نے اپنے دل میں اللہ کی محبت داخل کی۔ اور اس کا

اپنے اندر اثبات کیا۔

مشائخ چشتیہ فرماتے ہیں کہ اس ذکر میں سب سے بڑی چیز مرید کا اپنے دل کو شیخ کے ساتھ باعتبار اس کی محبت اور اس کے احترام کے مربوط کرنا اور اس کی صورت کا تصور کرنا ہے۔ اس سلسلے میں میرا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار مظاہر ہیں۔ کوئی بھی عبادت گزار خواہ وہ کند ذہن ہو یا ذکی، جب وہ خدا کی عبادت کرتا ہے تو خدا کے بے شمار مظاہر میں سے ایک نہ ایک مظہر اس کے روبرو ضرور ہوتا ہے۔ اور اس منزل میں یہی مظہر اس عبادت گزار کا معبود بن جاتا ہے۔ یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر شریعت نے نماز میں قبلہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور ذاتِ باری کے متعلق "اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ" ثابت کیا ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد بھی آتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو وہ اپنے سامنے نہ تھوکے کیونکہ اس کے اور اس کے قبلۂ نماز کے درمیان خدا خود موجود ہے۔ اسی ذیل میں آپؐ کا واقعہ بھی آتا ہے کہ آپؐ نے ایک حبشن لونڈی سے پوچھا کہ خدا کہاں ہے؟۔ اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ پھر آپؐ نے سوال کیا کہ میں کون ہوں؟۔ اس نے اس نے اس طرح کا اشارہ کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا نے آپؐ کو بھیجا ہے۔ اس پہ آپؐ نے فرمایا کہ یہ لونڈی مومنہ ہے ــــ الغرض اے سالک! تمہیں چاہیئے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف ہرگز توجہ نہ کرو۔ اور نہ اُسے چھوڑ کر اپنے دل کو کسی اور سے وابستہ کرو۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرتے ہوئے تم عرش کی طرف توجہ کرو۔ یا اس ضمن میں اس نور کا تصور کرو جو عرش کے اوپر ہے اور جس کا کھلا ہوا چاندنی روشنی کی طرح ہے۔ نیز تم خدا کی طرف اس طرح توجہ کر سکتے ہو کہ اس کے لیے تم نماز میں قبلہ کی طرف توجہ کرو۔ جیسے کہ اوپر کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد وارد ہوا ہے۔

یہ گویا اس حدیث کے مطابق مراقبہ ہوگا۔

بعد ازاں جب طالب کا دل ذکر کے نور سے منور ہو جائے تو پھر مرشد کو چاہیے کہ وہ مُرید کو مراقبہ کرنے کا کہے۔ مراقبہ لفظ رقیب سے ہے، جس کے معنی نگرانی اور محافظت کے ہیں مشتق ہے۔ اور مراقبہ کو مراقبہ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں طالب اپنے دل پر نگاہ رکھتا ہے۔ یا جس طرح کہ اللہ تعالیٰ بندے کی نگرانی کرتا اور اس کو اپنی نظر میں رکھتا ہے، اسی طرح مراقبہ میں بندہ اللہ تعالیٰ کا خیال رکھتا ہے اور اس کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ طالب کو چاہیے کہ وہ مراقبے میں یا تو اپنی زبان سے اَللّٰہُ حَاضِری۔ اَللّٰہُ نَاظِری۔ اَللّٰہُ شَاہِدِی۔ اَللّٰہُ مَعِی یا اَلَا اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ کہے۔ یا زبان کے بجائے اس کا خیال دل میں جمائے یا طالب مراقبے میں یوں سمجھے کہ اللہ اس کے اور قبلے کے درمیان ہے اور طالب اس کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

مشائخ چشتیہ فرماتے ہیں کہ ذکر و مراقبہ کے بعد جو چلّہ کھینچنا چاہے، اسے اس سلسلے میں ان چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے: مسلسل روزے رکھنا۔ برابر نماز پڑھنا، کم بولنا، کم کھانا، کم سونا۔ لوگوں سے میل جول کم رکھنا۔ جاگتے میں اور سوتے وقت برابر باوضو رہنا۔ دل کو مرشد سے مستقل طور پر مربوط رکھنا اور غفلت سے یکسر کنارہ کرنا۔ یہاں تک کہ طالب اسے حرام سمجھے۔ اس کے بعد جب طالب چلّہ کے حجرے میں دایاں پاؤں رکھے تو اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ اور بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھے اور تین بار سورۂ "والناس" کی تلاوت کرے۔ جب وہ بایاں پاؤں چلّے کے حجرے میں رکھے تو کہے "اے اللہ! تو ہی اس دنیا میں اور آخرت میں میرا مالک ہے تو میرے لیے ویسا ہی ہو جیسے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا۔ مجھے اپنی ذات سے محبت کی توفیق عطا فرما۔ مجھے اپنی محبت عنایت کر۔ اے اللہ! مجھے اپنے جمال کے تصور میں منہمک کر دے۔ مجھے اپنے مخلصین میں سے

بنا۔ اے اللہ! اپنی ذات کی کششوں سے میرے نفس کو یک سر مٹا دے۔ اے اللہ! تو انیس اور ساتھی ہے ہر اُس کا جس کا کوئی انیس اور ساتھی نہیں اے رب! مجھے اکیلا نہ چھوڑنا۔ اور تو ہی سب سے اچھا وارث ہے" اس کے بعد طالب مصلّے پر کھڑا ہو اور آیت اِنِّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِی فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ پڑھے۔ پھر دو رکعت نماز ادا کرے۔ پہلی رکعت میں آیت کرسی اور دوسری رکعت میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ.... تلاوت کرے۔ پھر ایک طویل سجدہ کرے۔ اور بڑی توجہ اور کوشش سے دعا مانگے۔ اور یَا فَتَّاحُ کا پانچ سو بار ذکر کرے۔ اس کے بعد وہ اُن اذکار میں مشغول ہو جائے، جن کو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

چشتی مشائخ فرماتے ہیں کہ جب طالب کسی مقبرے میں داخل ہو تو دو رکعت نماز پڑھے۔ اور ان رکعتوں میں سورہ اِنَّا فَتَحْنَا ختم کرے پھر وہ اس طرح بیٹھے کہ قبر اُس کے منہ کے سامنے ہو۔ کعبہ اُس کی پشت پر اور سورۂ الملک کی تلاوت کرے۔ اور اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے۔ پھر گیارہ مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے میت کے نزدیک ہو۔ اور گیارہ بار یَا رَبِّ یَا رَبِّ کہے۔ بعد ازاں یَا رُوْحُ کی ضرب آسمان کی طرف لگائے اور یَا رُوْحَ الرُّوْحِ کی دل میں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اندر انشراحِ خاطر اور نور محسوس کرے۔ اس کے بعد وہ منتظر رہے کہ صاحبِ قبر سے اُس کے دل پر کیا فیضان ہوتا ہے۔ چشتیہ کے ہاں ایک نماز معکوس کے نام سے بھی ہے لیکن ہم نے نہ تو سنت میں اور نہ فقہا کے اقوال میں اس کا کہیں ثبوت پایا ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں ایک نماز ہے جو نمازِ کُنْ فَیَکُوْن کہلاتی ہے۔

نمازِ کُن فَیَکُوْن کے متعلق چشتی بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو سخت مہم پیش آجائے تو اسے چاہیے کہ ہر ہفتے میں ہر بُدھ، جمعرات، اور جمعہ کی رات کو دو رکعت نماز ادا کرے۔ پہلی رکعت میں ایک بار سورۂ فاتحہ اور دو سو بار سورۂ اخلاص پڑھے۔ دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ سو بار اور سورۂ اخلاص ایک بار تلاوت کرے۔ پھر "اے آسان کنندۂ دشواری ہا واے روشن کنندۂ تاریکی ہا" سو بار کہے۔ سو بار استغفار پڑھے اور سو بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و فاتحہ بھیجے۔ اور حضورِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگے۔ اسی طرح دو راتوں تک برابر کرے۔ جب تیسری رات ہو تو اتنا کرنے کے بعد سر سے عمامہ اُتارے اور اپنی آستین کو گردن میں ڈالے اور روئے۔ اور پچاس بار اللہ تعالیٰ سے اپنی مراد مانگے۔ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مُراد بر لائے گا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

چھٹی فصل

نقشبندی مشائخ کے اشغال

نقشبندی مشائخ اس سلسلے کے امام خواجہ بہاؤالدین نقشبندی بخاری (اللہ ان سے اور ان کے پیروؤں سے راضی ہو) کے اصحاب ہیں۔ ان مشائخ کا ارشاد ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے تین راستے ہیں۔ ان تین میں سے ایک ذکر ہے۔ اور اسی میں نفی یعنی لَآ اِلٰہَ اور اثبات یعنی اِلَّا اللہُ کا ذکر بھی شامل ہے۔ یہ ذکر نفی و اثبات اس سلسلے کے متقدمین سے مروی ہے۔ اُن کے ہاں اس کی صورت یہ ہے کہ طالب ذکر کے لیے ایسا وقت ڈھونڈے، جس میں اُسے ایک طرف خارجی پریشانیوں یعنی لوگوں کی اِدھر اُدھر کی باتوں سے فرصت حاصل ہو۔ دوسری طرف وہ داخلی تشویشات یعنی حد سے زیادہ بھوک، غصے، اذیت اور حد سے زیادہ سیری سے مامون ہو۔ اِس کے بعد طالب موت کو یاد کرے۔ اور اس کا تصور اس طرح کرے گویا وہ اس کے سامنے موجود ہے۔ پھر وہ اپنے گناہوں سے مغفرت چاہے۔ اپنے ہونٹ بھینچے۔ آنکھوں کو بند کرے۔ سانس کو اپنے پیٹ میں روکے۔ اپنے دل میں لَآ کہے اور اسے اپنی ناف سے دائیں کو کھینچے اور یہاں تک کھینچتا چلا جائے کہ وہ اس کے شانوں تک پہنچے۔ پھر اپنے شانوں کو ہلائے اور انہیں سر کی طرف جھکا دے اور کہے اِلٰہَ۔ پھر اپنے دل میں اِلَّا اللہُ

کی سخت ضرب لگائے۔

نقشبندی مشائخ کا بیان ہے کہ سانس روکنے میں بڑی عجیب خاصیت ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ اس سے طالب کے باطن میں گرمی، عزم و ہمت میں یکسوئی اور عشق و محبت میں برانگیختگی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کو دل کے وسوسوں اور ادھر اُدھر کے خیالات سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ لیکن طالب کو سانس روکنے کی عادت بتدریج ڈالنی چاہیے تاکہ طبیعت پر اس کا زیادہ بار نہ پڑے۔ مطلب یہ کہ اس میں افراط نہ ہو۔ چنانچہ نقشبندیہ کے سانس روکنے میں اور جوگی جو سانس روکتے ہیں، ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ بزرگان نقشبندی مشائخ کے نزدیک اس حبس دم کی طرح طاق گنتی میں بھی بڑی خاصیت پائی جاتی ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ طالب پہلی بار کلمہ توحید کو ایک سانس میں تین مرتبہ کہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ آگے بڑھتا جائے۔ یہاں تک کہ وہ ایک سانس میں اکیس مرتبہ کلمۂ توحید کہہ جائے۔ لیکن اس میں طالب کو اس بات کی رعایت رکھنی چاہیے کہ وہ ہر بار کلمۂ توحید طاق مرتبہ ہی کہے۔ نقشبندی سلسلے کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ جب طالب لَآ اِلٰہَ کہے تو اللہ کے سوا ہر معبود، ہر مقصود اور ہر موجود کی نفی کرے۔ اور جب اِلَّا اللہُ تو پورے رسوخ اور کامل اطمینان قلب سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کی معبودیت، مقصودیت اور وجود کا اثبات کرے۔ اور اس کا یہ اثبات اس طرح کا نہ ہونا چاہیے جیسے دل میں کوئی خیال آیا اور نکل گیا۔

اب اگر ایک طالب ایک سانس میں اکیس مرتبہ کلمۂ توحید پڑھ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے اندر جذب اور اللہ کی طرف باطنی توجہ کا دروازہ نہیں کھلتا تو اُسے چاہیے کہ ہمہ تن اسم اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جائے باقی سارے مشاغل ترک کر دے۔ اور یہ جان لے کہ ابھی اس کا عمل مقبول نہیں

ہوا۔ پھر وہ کلمۂ توحید از سرِ نو پڑھنا شروع کرے۔ اور ایک سانس میں تین بار سے آہستہ آہستہ اس کو اکیس تک پہنچائے۔ ذکر کے ضمن میں ایک ذکر صرف اثباتِ مجرد[1] کا بھی ہے۔ لیکن یہ ذکر نقشبندی سلسلے کے مشائخ متقدمین سے منقول نہیں۔ اس ذکر کو خواجہ محمد باقی باللہ یا اُن کے قریبی زمانے میں کسی بزرگ نے ایجاد کیا ہے۔ باقی اس کے بارے میں اللہ بہتر جانتا ہے۔

اس سلسلے میں میں نے اپنے والد سے سُنا ہے کہ ذکر نفی واثبات یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا ذکر راہِ سلوک کے لیے زیادہ مفید ہے۔ اور ذکر اثباتِ مجرد یعنی صرف اَللہ کا ذکر راہِ جذبہ کے لیے زیادہ مؤثر رہتا ہے۔ ذکر اثباتِ مجرد کا طریقہ یہ ہے کہ اَللہ کو پوری قوت سے ناف سے نکالے۔ اور اس کو کھینچتا ہوا دماغ کی جھلی تک لے جائے۔ اس دوران سانس کو برابر روکے رکھے اور پھر آہستہ آہستہ ذکر کی رفتار بڑھاتا جائے۔ اس ذکر کے کرنے والے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک سانس میں ایک ہزار بار اَللہ کا ذکر کر لیتے ہیں۔ خود میں نے اپنے والد کی عقیدت مند عورتوں میں سے ایک کو دیکھا ہے کہ وہ ایک سانس میں ایک ہزار مرتبہ بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ اللہ کا ذکر کرتی تھی۔ نیز میں نے اپنے والد کو خود اپنے متعلق بیان کرتے سُنا ہے۔ فرماتے تھے کہ ابتدائے سلوک میں میں ایک سانس میں دو سو بار لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کا ذکر کیا کرتا تھا۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک اللہ تک پہنچنے کے جو تین طریقے ہیں، ان میں سے پہلا طریقہ ذکر کا ہے، جس کی تفصیلات گزر چکیں۔ ان میں سے دوسرا طریقہ مراقبے کا ہے۔ مراقبے کی صورت یہ ہے کہ طالب تھوڑی دیر کے لیے سانس کو ناف

---

[1] ذکر اثباتِ مجرد کے معنی یہ ہیں کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے بجائے صرف اللہ کا ذکر کیا جائے۔

کے نیچے روکے۔ پھر اپنے ادراک کی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اس مجرد اور بسیط حقیقت کی طرف متوجہ ہو جس کو ہر شخص اللہ کا نام لیتے وقت کسی نہ کسی صورت میں تصور کرتا ہے۔ گو ان میں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، جو اس مجرد اور بسیط حقیقت کو الفاظ سے الگ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ طالب کو چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو الفاظ سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کرے۔ اور ادھر ادھر کے خیالات کی دخل اندازی سے اپنے آپ کو دور رکھ کر اور کسی اور کی طرف اپنی توجہ کیے بغیر اس حقیقت مجردہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو۔ اکثر لوگوں کے لیے اس مجرد اور بسیط حقیقت کا ادراک ممکن نہیں۔ چنانچہ بعض مشائخ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک دعا بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے۔ طالب دل سے برابر دعا کرے اور کہے "اے رب! تو ہی میرا مقصود ہے۔ میں سب سے بیزار ہو کر تیری طرف آیا ہوں" الغرض طالب اس مقصد کے لیے یہ یا اس طرح کی کوئی اور مناجات کرے۔ بعض مشائخ تو طالب کو اس ضمن میں اس امر کی تلقین فرماتے ہیں کہ وہ مجرد خلا یا مجرد نور کا تصور کرے۔ اس سے طالب بتدریج اس قابل ہو جاتا ہے کہ اسم اللہ کی مجرد حقیقت کی طرف متوجہ ہو سکے۔

نقشبندی مشائخ کے نزدیک اللہ تک پہنچنے کا تیسرا طریقہ مرشد کے ساتھ کامل ربط کا ہے۔ اس کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ مرشد قوی التوجہ اور دوام یادداشت ہو۔ اس سلسلے میں مرید مرشد کے روبرو بیٹھے تو اپنے باطن کو مرشد کی محبت کے سوا ہر چیز سے خالی کر دے۔ اور ہمہ تن اس امر کا منتظر ہو کہ مرشد کی طرف سے اس پر کیا فیضان ہوتا ہے۔ اس حالت میں خواہ مرید اپنی آنکھیں بند کرے یا ان کو کھلا رکھے، وہ مرشد کی دو آنکھوں کے درمیان اپنی نظر جمادے۔ پھر مرشد کی ذات سے جب اس پر کچھ فیضان ہو، تو طالب

دل وجان سے اُس فیضان کے پیچھے پڑ جائے ۔ اور برابر اس فیضان کی حفاظت کرے ۔ او جب مُرشد اُس کے سامنے سے ہٹ جائے تو پھر بھی مُرید مُرشد کے تصور کو اپنے پیش نظر رکھے لیکن مرشد کا یہ تصور صرف احترام اور محبت کے اعتبار سے ہی ہونا چاہیے ۔ مُرشد کا یہ تصور وہی فائدہ دے گا جو کہ اس کی محبت سے حاصل ہوتا ہے ۔

میں نے اپنے والد بزرگوار سے سُنا ہے ۔ فرماتے تھے کہ سالک کو چاہیے کہ جب مُرشد سے اُسے کوئی فیضان نصیب ہو تو اس وقت وہ جس وضع یا ہیئت پر ہو، اُسی وضع اور ہیئت پر قائم رہے ۔ اور اس کو بدلے نہیں مثلاً اگر وہ کھڑا ہے تو کھڑا ہی رہے، بیٹھے نہیں ۔ اگر بیٹھا ہے تو بیٹھا ہی رہے، اُٹھے نہیں ۔ بعض مشائخ اپنے مریدوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے دل کا اس طرح تصور کریں گویا اُس کے اُوپر لفظ اَللّٰہ سونے سے لکھا ہوا ہے ۔ والد بزرگوار فرماتے تھے ۔ میں دس سال کا تھا کہ مجھے خواجہ ہاشم بخاری نے اسم ذات یعنی لفظ اَللّٰہ لکھنے کا حکم دیا ۔ میں نے اسے بہت لکھا ۔ میرے دل وجان میں یہ چیز اس طرح سما گئی کہ ایک دفعہ میں ایک کتاب لکھ رہا تھا تو میں بجائے اس کتاب کو لکھنے کے تقریباً چار ورق تک اسم اللہ ہی لکھتا چلا گیا ۔ اور مجھے مطلق اس کا خیال نہ رہا کہ میں کیا لکھ رہا ہوں ۔ نیز میں نے اپنے والد کو فرماتے سُنا ہے کہ میں نے خواجہ محمد باقی کے صاحب زادے خواجہ خُورد کو دیکھا کہ وہ مجلس میں بیٹھے لوگوں سے باتیں کرتے اور دوسرے کام کرتے اپنے انگوٹھے سے باقی چار انگلیوں پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے ۔ میں نے اس کے متعلق ان سے پوچھا تو اُنھوں نے فرمایا کہ ابتدائے سلوک میں میں اسم اللہ لکھتا رہا ہوں، اور یہ چیز میرے لیے اب گویا عادت بن گئی ہے ۔ اب میرے لیے اس

کا چھوڑنا ناممکن ہوگیا ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

نقشبندی مشائخ میں چند اصطلاحات مروج ہیں، جن پر کہ اُن کے طریقے کی بنیاد ہے۔ ان میں سے کچھ اصطلاحات تو نقشبندی سلسلے کے اُن اشغال کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ کچھ اصطلاحات ان شروط کو بیان کرتی ہیں، جو ان اشغال کی تاثیر کے لیے ضروری ہیں۔ یہ اصطلاحات حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہوش در دم (۲) نظر بر قدم (۳) سفر در وطن (۴) خلوت در انجمن (۵) یاد کرد (۶) بازگشت (۷) نگہداشت (۸) یادداشت۔ یہ آٹھ اصطلاحیں خواجہ عبدالخالق غجدوانی سے منقول ہیں۔ بعد میں ان میں خواجہ نقشبند نے ان تین کا یعنی (۱) وقوف زمانی (۲) وقوف قلبی (۳) وقوف عددی کا اور اضافہ کیا ہے۔

"ہوش در دم" کے معنی یہ ہیں کہ اپنے ہر ہر سانس پر طالب اپنے دل کو بیدار رکھے۔ اور ہر لحظہ اپنے نفس پر اُس کی نگاہ رہے کہ آیا وہ غافل ہے یا ذکر میں مشغول۔ اِس سے طالب بتدریج ترقی کرتے ہوئے "دوامِ حضور" کی منزل پر پہنچتا ہے۔ یہ شغل راہِ سلوک کے مبتدی کا ہے، جو طالب سلوک میں اس سے آگے اور دوسرے درجے میں پہنچے تو اُسے چاہیے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے نفس کی ٹوہ لگائے اور دیکھے کہ یہ گھڑی جو اس پر گزری ہے، اِس میں اُس پہ غفلت کا اثر تھا یا نہیں۔ اگر وہ محسوس کرے کہ اُس پر غفلت کا اثر تھا تو وہ توبہ استغفار کرے اور عزم کرے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس سے طالب "دوام" کے شغل پہ پہنچ جاتا ہے۔ اور اِسی "دوام" کا نام "وقوفِ زمانی" ہے۔ یہ اصطلاح خواجہ نقشبند نے وضع فرمائی ہے۔ اِس کی ضرورت اُن کو اس لیے پیش آئی کہ اُنھوں نے دیکھا کہ ہر لحظہ ایک متوسط درجے کے طالب کو "علم العلم" یعنی ایک جانی

ہوئی چیز کے متعلق یہ جاننے کا خیال کہ میں اسے جانتا ہوں یا نہیں، بڑی طرح تشویش میں رکھتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے سوچا کہ اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ طالب اللہ کی طرف توجہ کرنے میں اس طرح مستغرق ہو جائے کہ اُسے یہ چیز پریشان ہی نہ کرے کہ اُسے اس توجہ الی اللہ کا علم ہے یا نہیں؟

"نظر بر قدم" سے مراد یہ ہے کہ سالک جب چلے تو اپنے قدموں کے سوا کسی اَور چیز کی طرف نہ دیکھے۔ اور بیٹھے تو صرف اپنے سامنے ہی نگاہ رکھے۔ بات یہ ہے کہ ادھر اُدھر کے مختلف نقوش اور طرح طرح کے دلکش رنگوں کو دیکھنے سے ایک تو سالک کی باطنی کیفیت میں خلل آجاتا ہے۔ دوسرے جس چیز کی اُسے طلب ہوتی ہے، وہ بھی اُس کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اور اس کا طالب پر وہی اثر پڑتا ہے جو لوگوں کے شور و غوغا اور ان کی باتوں کا اس پر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے والد بزرگوار سے سُنا ہے کہ "نظر بر قدم" کی یہ صورت صرف مبتدی کے لیے ہے۔ باقی رہا منتہی کا معاملہ۔ اس مسئلے میں اس کو چاہیے کہ وہ اپنا سارا دھیان اس بات پر دے کہ وہ انبیا علیہم السّلام میں سے کس نبی کے قدموں پر چل رہا ہے۔ اب اولیا میں سے بعض ولی تو ایسے ہوتے ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر چلتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ان میں بھی پوری جامعیت ہوتی ہے۔ اور بعض اُن میں سے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اسی پر دوسروں کو بھی قیاس کر لو۔ الغرض جب راہِ سلوک کا منتہی ان معنوں میں اپنے پیشوا کو جان لے تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے احوال و کوائف کو اپنے پیشوا کے احوال و کوائف کے مطابق بنائے۔ چنانچہ یہ اُس کے لیے "نظر بر قدم" کا شغل ہے۔

باقی رہا "سفر در وطن" تو اس سے مراد ہے طالب کا پست انسانی صفات سے بلند ہو کر ملکی فضائل میں منتقل ہونا۔ اس مقام کے حصول کے لیے سالک کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس کی خوب چھان بین کرے اور دیکھے کہیں اس میں ماسوی اللہ کی محبت تو پوشیدہ نہیں۔ اگر وہ محسوس کرے کہ اس کے نفس میں یہ محبت جاگزیں ہے تو اُس کو نئے سرے سے توبہ استغفار کرنی چاہیے۔ اس ضمن میں طالب ماسوی اللہ کی محبت کو یوں سمجھے جیسے کہ وہ ایک بُت ہے اس کو توڑنے کے لیے وہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ذکر کرے۔ یعنی وہ برابر اس بات کا اقرار کرتا رہے کہ میں فلاں چیز کی محبت کو دل سے محو کر رہا ہوں۔ اور اس کی جگہ خدا کی محبت کا اثبات کرتا ہوں۔ سالک کو اس کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ انسان کے دل میں محبت کی بہت سی پوشیدہ رگیں ہیں اور اُن کو دل سے نکال باہر کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک ان کی خوب جانچ پڑتال نہ کی جائے۔ ان کے علاوہ سالک کو اس سلسلے میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کے دل میں کسی سے حسد، کینہ یا مخالفت تو نہیں۔ اس کے تدارک کی یہ صورت ہے کہ وہ برابر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا ورد کرے۔

"خلوت در انجمن" کے معنی یہ ہیں کہ سالک کسی حال میں ہو یعنی وہ پڑھ رہا ہو، گفتگو میں مصروف ہو۔ کھا پی رہا ہو۔ چل پھر رہا ہو۔ الغرض وہ کسی حال میں ہو۔ اس کا دل برابر اللہ کے ذکر میں مشغول رہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ سالک اپنے اندر اللہ کی طرف توجہ کرنے کا ایک ایسا ملکہ پیدا کرے کہ اتنی ہول کی مصروفیت کے باوجود اس کی توجہ اللہ سے نہ ہٹے۔ خواجہ نقشبند فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اس ضمن میں واضح رہے کہ

فقرا کا سا لباس پہننا اور اللہ کی طرف ہمہ وقت متوجہ رہنا، اس پر لیسا اوقات ریا کاری اور شہرت پسندی کا بھی گمان ہوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب سالک اس مقام پر ہو۔ تو اصحاب علم، دین داروں اور عبادت گزاروں کی وضع اختیار کرے۔ اور دل کو برابر اللہ تعالیٰ سے متعلق رکھے۔ خواجہ رامتینی نے اس سلسلے میں کیا خوب کہا ہے ؎

از دروں شو آشنا واز بروں بیگانہ وش

این چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

"یاد کرد" سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ہے۔ اور وہ خواہ ذکر نفی و اثبات ہو یا محض ذکر اثبات مجرد۔ ان ہر دو کا بیان تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

باقی رہا "بازگشت"۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر دفعہ تین مرتبہ ذکر کرنے کے بعد سالک مناجات کرے۔ اور اللہ تعالیٰ سے اپنی پوری ہمت اور توجہ کے ساتھ دعا مانگے اور کہے "اے رب تو ہی میرا مقصود ہے۔ میں نے تیرے لیے دنیا اور آخرت دونوں کو چھوڑا۔ مجھ پر اپنی نعمت کو مکمل کر اور مجھے اپنا پورا وصال عطا فرما"۔ اسی سلسلے میں میں نے والد بزرگوار سے سنا ہے کہ ذکر کے لیے "بازگشت" بہت بڑی شرط ہے۔ سالک کو چاہیے کہ اس سے ذرا بھی غفلت نہ برتے۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب اسی "باز گشت" کی برکت ہے۔

"نگاہداشت" عبارت ہے دل سے اِدھر اُدھر کے خیالات ہٹانے اور وسوسوں کو دور کرنے سے۔ اس لیے سالک کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ چوکنا رہے اور دل میں کوئی ایک خیال بھی نہ آنے دے۔ خواجہ نقشبند فرماتے ہیں کہ سالک کے لیے ضروری ہے کہ دل میں جونہی کوئی خیال ظاہر ہونے لگے، اُس کو فوراً روک

دے۔ ورنہ اگر وہ خیال ظاہر ہوگیا تو پھر طبیعت خود بخود اس طرف مائل ہو جائے گی۔ اور یہ خیال طبیعت کو متاثر کرکے رہے گا۔ اس حالت میں اُس کو دل سے دور کرنا مشکل ہو جائے گا۔ "نگاہداشت" سے سالک کے اندر ذہن کو ہر طرح کے خیالات اور وسوسوں سے خالی رکھنے کا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔

باقی رہا "یاد داشت" تو وہ واجب الوجود کی حقیقت کی طرف خالص توجہ کرنے سے عبارت ہے۔ ایسی توجہ جو الفاظ اور تخیلات سے مجرد ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس نوع کی توجہ فنائے تام اور بقائے مکمل کے بغیر ٹھیک طرح ہو ہی نہیں سکتی۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

"وقوفِ زمانی" کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے۔ اب رہا "وقوفِ عددی" تو اس سے مراد یہ ہے کہ ذکر و اذکار میں طاق گنتی پر ہمیشہ نظر رہے۔ اس مسئلے پر بھی ہم پہلے گفتگو کر آئے ہیں۔ "وقوفِ قلبی" یہ ہے کہ سالک کی توجہ دل کی طرف رہے۔ جو چھاتی کے نیچے بائیں طرف واقعہ ہے۔ نقشبندی طریقے میں دل کی طرف توجہ کرنے میں وہی حکمت ہے، جو قادری طریقے میں دورانِ ذکر ضربوں پر نگاہ رکھنے میں ہے۔ یعنی اس کی وجہ سے توجہ دوسروں سے ہٹ کر صرف اپنی طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور آگے چل کر یہی ذریعہ بنتی ہے توجہ الی الحق کا۔

نقشبندیوں میں عجیب و غریب تصرفات کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ہمت کو کسی خاص مدعا پر اس طرح متوجہ کر دینا کہ وہ مدعا ہمت کے مطابق ہی سرانجام پائے۔ مُرید پر اپنا اثر ڈالنا۔ مریض کو مرض سے اچھا کرنا۔ گناہ گار سے توبہ کرانا۔ لوگوں کے دلوں پر اس طرح تصرف کرنا کہ وہ ان کو اپنا محبوب سمجھیں اور ان کی تعظیم کریں۔ ان کے ذہنوں میں ایسا تصرف کرنا کہ ان میں بڑے بڑے واقعات متمثل ہو جائیں۔ اللہ کے مقبول بندوں کی خواہ وہ زندہ ہوں یا قبر وں

میں مدفون، تصوف اور طریقت میں جو "نسبت" تھی، اس پر اطلاع پانا۔ لوگوں کے دلوں میں جو خیالات آتے ہیں اور جو کچھ وہ سوچتے ہیں، اُن پر آگاہی حاصل کرنا، مستقبل میں ہونے والے واقعات معلوم کرنا۔ اور نازل ہونے والی بلاؤں کو دور کرنا۔ یہ اور اس طرح کی اور چیزیں۔ الغرض یہ سب نقشبندی بزرگوں کے تصرفات میں شمار ہوتی ہیں۔ ہم یہاں ان تصرفات کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں۔

نقشبندیہ میں جو بڑے بڑے اصحابِ فنا و بقا بزرگ ہیں اُن کے تصرفات کی شان کا تو کیا کہنا۔ لیکن ان کے علاوہ جو دوسرے بزرگ ہیں، وہ جب طالب پر اپنی تاثیر ڈالتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مُرشد طالب کے نفسِ ناطقہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور اُس پر اپنی پوری ہمت سے شدت کے ساتھ ضرب لگاتا ہے۔ اس کے بعد مُرشد پورے حضورِ قلب سے خود اپنی نسبتِ باطنی میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ استغراق اُس وقت ہی ممکن ہوتا ہے، جب کہ خود مُرشد کے نفسِ ناطقہ میں تصوف کی "نسبتوں" میں سے کوئی "نسبت" موجود ہو۔ اور یہ "نسبت" اُس کے اندر ایک مستقل ملکہ کی حیثیت حاصل کر چکی ہو۔ اس صورت میں یہ "نسبت" مُرشد کے نفسِ ناطقہ سے مُرید کے نفسِ ناطقہ میں اُس کی استعداد کے مطابق منتقل ہو جاتی ہے۔ بعض نقشبندی مُرشد ایسے بھی ہیں کہ مُرید کے نفسِ ناطقہ پر توجہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ ذکر بھی کرتے ہیں۔ اور ذکر کی ضربیں طالب کے دل پر لگاتے ہیں۔ اگر طالب اُن کے سامنے موجود نہیں ہوتا تو وہ اس کی صورت کا تخیل اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ اور اس پر اپنی توجہ ڈالتے ہیں۔

اس ضمن میں "ہمت" کے یہ معنی ہیں کہ سالک کو پوری جمعیت خاطر ہو اور اُس کا عزم و ارادہ اس طرح مضبوط ہو جیسے کسی چیز کی تمنا کرتے وقت یا اُسے حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں سوائے اس تمنا و طلب کے

آدمی کے دل میں اور کوئی خیال نہیں آتا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے ایک پیاسا ہے اور وہ پانی طلب کر رہا ہے۔ مجھے ایک بزرگ نے، جس پر مجھے پورا اعتماد ہے، بتایا ہے کہ بعض مشائخ جب نفی و اثبات یعنی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا ذکر کرتے ہیں تو اس ذکر سے اُن کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس آفت کو کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اور کوئی رزق دینے والا نہیں یا جس چیز کی انہیں تمنا ہے اس کو کوئی پورا کرنے والا سوائے اللہ کے نہیں اور وہی ہے اس کام کا کرنے والا۔ مرض دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شیخ اپنے آپ کو مریض تصور کرے اور یوں سمجھے کہ مریض کی بیماری گویا اُسے لاحق ہے پھر وہ اپنی "ہمت" کو اس طرح جمع کرے کہ خاص اس خیال کے سوا کوئی خیال اس کے دل میں راہ نہ پا سکے۔ اس طرح کرنے سے بیمار کی بیماری خود شیخ میں منتقل ہو جائے گی۔ یہ ایک عجوبہ ہے اللہ کی قدرت کے عجائبات میں سے۔

گناہ گار کو اس کے گناہوں سے توبہ کرانے کی صورت یہ ہے کہ شیخ گناہ گار کے نفس کا تصور کرے اور اس پر اپنی تاثیر ڈالے۔ وہ یوں سمجھے کہ اس کا نفس گناہ گار کے نفس سے مل گیا ہے اور دونوں میں ایک طرح کا اتصال ہو گیا ہے۔ اس کے بعد شیخ ازسرِ نو اپنا عمل توجہ شروع کرے۔ وہ گناہ پر نادم ہو اور اللہ سے اس کی مغفرت چاہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ گناہ گار جلد ہی توبہ کر لے گا۔

لوگوں کے دلوں میں اس غرض سے کہ وہ تصرف کرنے والے مشائخ سے محبت کریں اور ان کے ادراک میں باہر کے واقعات متمثل ہو سکیں، الغرض اس مقصد کے لیے تصرف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شیخ اپنی پوری "ہمت" سے طالب کے نفس پر ضرب لگائے اور طالب کے نفس کو اپنے نفس سے متصل کرے۔ پھر وہ اس محبت اور واقعہ کو جو اس کے پیشِ نظر ہے، تصور کرے۔ اور اس تصور کی طرف اپنی پوری جمعیتِ خاطر سے متوجہ ہو۔ یقیناً اس سے وہ شخص جس پر کہ توجہ کی

جاتی ہے، ضرور متاثر ہوگا۔ اُس کے دل میں شیخ کے لیے محبت پیدا ہو جائے گی۔ اور اُس کے ادراک میں پیشِ نظر واقعہ صورت پذیر ہو جائے گا۔

باقی رہا اللہ والوں کی "نسبتِ تصوف" کو معلوم کرنا۔ سو اس کی صورت یہ ہے کہ اگر وہ بزرگ زندہ ہو تو طالب اُس کے سامنے بیٹھ جائے۔ اگر وہ وفات پا چکا ہو تو طالب اس کی قبر پر بیٹھے۔ اپنے نفس کو "ہر نسبت" سے خالی کر دے۔ اور اپنی روح کو اس بزرگ کی روح تک کچھ عرصے کے لیے پہنچا دے۔ یہاں تک کہ اس کی روح اس بزرگ کی روح سے مل جائے اور دونوں میں اختلاط ہو جائے۔ اِس کے بعد طالب خود اپنے نفس کی طرف متوجہ ہو۔ اس حالت میں جو کیفیت بھی وہ اپنے اندر پائے گا، یہی کیفیت اس بزرگ کی "نسبتِ تصوف" ہوگی۔

لوگوں کے دلوں کی مخفی باتیں معلوم کرنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے تو اپنے نفس کو شیخ ہر بات اور خیال سے خالی کر دے۔ پھر وہ اپنے نفس کو اُس شخص کے نفس تک، جس کے دل کی اُسے بات معلوم کرنی ہے متصل کر دے۔ اس حالت میں شیخ کے دل میں جو بھی بات یا خیال منعکس ہوگا، وہ اُس شخص کے دل کی بات اور خیال ہوگا۔

باقی رہا مستقبل میں ہونے والے واقعات کا انکشاف۔ سو اس کی صورت یہ ہے کہ شیخ اپنے نفس سے ہر خیال کو نکال دے۔ پھر وہ ہونے والے واقعہ کا پوری توجہ سے انتظار کرے۔ جب شیخ کی یہ کیفیت ہو کہ اس کے دل سے ہر قسم کے خیالات نکل چکے ہوں، اور وہ آئندہ کے واقعات کے لیے اس طرح بے تاب ہو، جیسے کہ ایک پیاسا پانی کے لیے بے تاب ہوتا ہے تو وہ لامحالہ اس حالت میں کوشش کرے گا کہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے نفس کو اپنی استعداد کے مطابق ملاءِ اعلیٰ اور ملاءِ سافل تک پہنچائے اور سب سے کٹ کر انہیں کی طرف یکسوئی اختیار کرے۔ الغرض جب شیخ کے نفس

کی یہ کیفیت ہو تو اس حالت میں جلد ہی اس پر واقعۂ آئندہ کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ خواہ اس انکشاف کی صورت یہ ہو کہ وہ ہاتف کی آواز سنے یا وہ بیداری میں یا خواب میں اس واقعہ کو دیکھے۔

جہاں تک نازل ہونے والی بلاؤں کو دور کرنے کا تعلق ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ شیخ اس بلا کی مثالی صورت کا تصور کرے۔ پھر تصور ہی تصور میں اپنی تمام قوت سے اس بلا کا مقابلہ کرے۔ اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ پھر اپنی پوری "ہمت" کو اس مقصد پر لگا دے۔ اس حالت میں وہ اپنے نفس کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ملاء اعلیٰ اور ملاء سافل کی بلندیوں کی طرف لے جائے۔ اور ان کی طرف بالکل یکسو ہو جائے۔ اس طرح کرنے سے جلد ہی یہ بلا دفع ہو جائے گی۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

غرضیکہ یہ اور اسی سے ملتے جلتے جو اور تصرفات ہیں اُن کے لیے شرط یہ ہے کہ تاثیر ڈالنے والے کے نفس کا اُس شخص کے نفس سے جس پر کہ تاثیر ڈالی جا رہی ہے۔ اتصال ہو۔ اُس کا نفس دوسرے نفس سے مل جائے اور اس سے پیوست ہو جائے۔ وہ بزرگ جو بدن کے حجابات سے تجرد اختیار کر چکے ہیں، وہ اس "اتصال" کی کیفیت خوب جانتے ہیں۔ اور وہ اس کے حصول پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ قصّہ مختصر، یہ سب اشغال جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں، وہ ہیں جو میرے والد بزرگوار پسند کرتے تھے۔

شیخ احمد سرہندی کے اشغال ان کے علاوہ ہیں۔ اور ہم یہاں اجمالی طور پر اُن کا ذکر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ نے انسان میں چھ لطیفے پیدا کیے ہیں۔ اور جیسا کہ شیخ احمد سرہندی اور اُن کے متبعین کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، ان میں سے ہر ایک لطیفہ ایک مستقل حقیقت ہے۔ آپ ان چھ لطیفوں کو نفس ناطقہ کی چھ جہتیں یا اس کے چھ

اعتبارات سمجھ لیجیے۔ اس نفسِ ناطقہ کا ایک اعتبار سے "قلب" نام ہے اور اسی کو دوسرے اعتبار سے "روح" کہتے ہیں۔ اسی طرح اس کے دوسرے نام ہیں۔ میرے والد بزرگوار نے اسی توجیہہ کو پسند فرمایا۔ اور نفسِ ناطقہ کی ان جہتوں کی تصویریں کھینچ کر مجھے بتایا۔ پہلے آپ نے ایک دائرہ کھینچا اور کہا، یہ قلب ہے۔ پھر اس دائرے کے اندر ایک اور دائرہ کھینچا اور فرمایا کہ یہ "روح" ہے۔ اس کے اندر آپ نے تیسرا، پھر چوتھا اور پانچواں اور آخر میں چھٹا دائرہ کھینچا اور فرمایا یہ چھٹا دائرہ "انا" ہے۔ والد بزرگوار نے فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک دائرہ دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ نفسِ ناطقہ کی ان جہتوں کے متعلق اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے جو صوفیا کے ہاں مشہور ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ ابنِ آدم کے بدن میں ایک "قلب" ہے اور "قلب" کے اندر ایک "روح" ہے۔ علیٰ ہذا القیاس "روح" کے اندر ایک اور لطیفہ ہے۔ یہاں تک کہ اس کا سلسلہ چھ لطیفوں تک پہنچتا ہے۔ مجھے اس حدیث کے پورے الفاظ یاد نہیں خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ ان لطائف کے بیان کرنے سے شیخ احمد سرہندی کی غرض یہ ہے کہ ان لطائف میں سے ہر لطیفہ کا تعلق بدن کے کسی نہ کسی عضو سے ہے۔ "قلب" بائیں چھاتی سے دو انگل نیچے واقع ہے۔ "روح" دائیں چھاتی کے نیچے عین "قلب" کے برابر ہے۔ "سِر" دائیں چھاتی کے اوپر سینے کے وسط کی طرف جُھکا ہوا ہے۔ "خفی" بائیں چھاتی کے اوپر سینے کی طرف جُھکا ہوا ہے۔ "اخفیٰ" "خفی" کے اوپر ہے۔ "سِر" وسط میں ہے۔ اور "نفس" دماغ کی پہلی تہ میں ہے۔ یہ سب کے سب اعضا نبض کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں کہ طالب کو ان اعضا کی اس حرکت پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ اور اس حرکت کا تصور اسے اس طرح کرنا چاہیے گویا کہ اسمِ ذات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد طالب نفی و اثبات کا ذکر کرے اور وہ اس طرح کہ وہ لفظ "لا" کو کھینچتا ہوا تمام لطائف پر حاوی کر دے اور "اِلّا اللہ" کی ضرب "قلب" پر لگائے۔

"نسبت" کی حقیقت

تصوف کے یہ جتنے طریقے اوپر بیان ہوئے، ان سب کا مقصد یہ ہے کہ طالب کے نفسِ ناطقہ کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کیفیت کو صوفیا نے "نسبت" کا نام دیا ہے۔ اس کو "نسبت" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیفیت عبارت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتساب اور ارتباط سے۔ اس کو "سکینہ" اور "نور" بھی کہتے ہیں۔ یہ کیفیت نفسِ ناطقہ کے اندر حلول کرتی ہے۔ یہ ملائکہ سے مشابہ ہوتی ہے۔ اور اس کی نگاہ عالمِ جبروت کے حقائق پر پڑتی ہے۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ طالب جب عبادات، طہارات اور ذکر واذکار پر برابر عامل رہے تو اس کے نفسِ ناطقہ کے اندر فرشتوں کے مشابہ ایک مستقل صفت اور عالمِ جبروت کی طرف "توجہ" کا راسخ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ فرشتوں کے مشابہ مستقل صفت اور عالمِ جبروت کی "توجہ" یہ دو شاخیں ہیں "نسبت" کی۔ اور ان میں سے ہر ایک شاخ کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ایک عشق و محبت کی "نسبت" ہے۔ عشق و محبت کی "نسبت" دل کی مستقل صفت ہوتی ہے۔ اور ایک "نفسِ مکنی" اور اس کی لذتوں سے براءتِ کلی کی "نسبت" ہے۔ میرے والد بزرگوار اس "نسبت" کو "نسبتِ اہلِ بیت" کا نام دیا کرتے تھے۔ ایک "مشاہدہ" کی "نسبت" ہے۔ اور اس سے مراد مجرد محض کی طرف توجہ کرنے

کے ملکہ سے ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضوری کے بہت سے رنگ ہیں۔ ان میں سے کبھی تو محبت کا رنگ ہوتا ہے اور کبھی نفس شکنی کا۔ کبھی ان کے علاوہ "یاد داشت" کا رنگ ہوتا ہے۔ جب کبھی طالب کے نفس ناطقہ میں اس رنگ کا مستقل ملکہ پیدا ہو جاتا ہے تو یہ ملکہ "نسبت" کہلاتا ہے۔ "نسبتیں" بہت سی ہیں۔ اور جو بزرگ "صاحب سِرّ" ہیں، وہ ان نسبتوں میں سے ایک ایک کو علیحدہ علیحدہ جانتے ہیں۔ طریقت کے اشغال و وظائف سے دراصل مطلب بھی یہی ہے کہ طالب "ان نسبتوں" میں سے کسی ایک "نسبت" کو حاصل کرے اس پر وہ برابر قائم رہے اور اس "نسبت" میں اُسے استغراق حاصل ہو جائے۔ یہاں تک کہ "یہ نسبت" طالب کے نفس ناطقہ کے لیے ایک مستقل ملکہ بن جائے۔

تمہیں کہیں یہ گمان نہ ہو کہ "یہ نسبتیں" صرف ان اشغال و وظائف ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ "ان نسبتوں" کے حصول کا ایک طریقہ یہ اشغال و وظائف بھی ہیں، لیکن اس کے علاوہ ان کے حصول کے اور طریقے بھی ہیں۔ میرے نزدیک اس مسئلے میں رائے غالب یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین ان اشغال و وظائف کے علاوہ "سکینہ کی نسبت" دوسرے طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ خلوت میں پورے خضوع و حضور کے ساتھ نمازیں پڑھتے۔ اور ذکر و تسبیح کرتے اور طہارت پر برابر قائم رہتے۔ موت جو دنیاوی لذتوں کو مٹانے والی ہے، اُس کو ہر دم یاد کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں برداروں کے لیے ثواب اور نافرمانوں کے لیے جو عذاب مقرر کر رکھا ہے، اُس پر دھیان دینے سے مادی لذتوں سے اُن کی طبیعت اُچاٹ ہو جاتی۔ اور دل ان سے بے تعلق

ہو جاتا۔ چنانچہ اس طریق سے اُن میں "یہ نسبت" پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے حصول کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ قرآن مجید کی برابر تلاوت کرتے۔ اور اس کے معانی و مطالب میں غور و تدبر فرماتے۔ نیز وعظ و نصیحت کی باتیں اور دل کو نرم کرنے والی احادیث سنتے۔ الغرض وہ ان چیزوں کو ایک مدتِ دراز تک باقاعدگی سے کرتے۔ اِس سے اُن کے اندر ایک مستقل ملکہ اور ایک نفسی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ وہ اس مستقل ملکہ اور اس نفسی کیفیت کی آخر عمر تک برابر حفاظت کرتے۔ یہ ہے وہ کیفیت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ کے ذریعہ وراثۃً چلی آتی ہے۔ اب اس کیفیت کے برحق ہونے میں تو کوئی شک نہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ اس کیفیت کے کئی رنگ ہیں اور اس کے حصول کے بھی متعدد طریقے ہیں۔

میں نے اپنے والد بزرگوار قدس سرہٗ کو ایک طویل واقعہ بیان کرتے سُنا۔ فرماتے تھے کہ میں نے خواب میں حضرات حسن، حسین اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو دیکھا۔ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے اپنی "نسبت" کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ وہی "نسبت" ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ لوگوں کے ہاں ہوتی تھی۔ اِس پر حضرت علی رض نے مجھے اپنی "نسبت" میں استغراق کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے بھی اِس میں پورا غور و تامل کیا۔ پھر فرمایا کہ ہاں ہاں یہ وہی "نسبت" ہے بلا کسی فرق کے۔

جو طالب "نسبتِ سکینہ" پر برابر قائم رہے، اُس پر وقتاً فوقتاً بڑے بڑے بلند مرتبہ احوال و کوائف وارد ہوتے رہتے ہیں۔ طالب کو چاہیے کہ وہ ان مواقع کو غنیمت سمجھے اور جان لے کہ یہ احوال اس کی طاعات و عبادات کے قبول ہونے اور باطن نفس اور سویدائے دل میں ان کے مؤثر

ہونے کی علامات ہیں۔

اِن بلند مرتبہ احوال میں سے ایک یہ ہے کہ طالب سب چیزوں پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طاعت و فرماں برداری کو ترجیح دے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس ضمن میں امام مالکؒ نے موطّا میں عبد اللہ بن ابو بکرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک دن ابو طلحہؓ انصاری اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک خوش رنگ چڑیا اُڑی اور وہ برابر اِدھر اُدھر چکر لگاتی اور باغ کے گھنے درختوں میں سے نکلنے کی جگہ تلاش کرتی رہی۔ ابو طلحہؓ کو یہ منظر بہت پسند آیا۔ اور اُنھوں نے نماز ہی میں اِس چڑیا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بار نظر اُٹھاتے۔ اس چڑیا کو دیکھ لیتے پھر نماز میں مصروف ہو جاتے۔ اس دوران وہ بھول گئے کہ اُنھوں نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔ اِس پر اُنہیں تنبہ ہوا کہ نماز میں یہ خلل میرے اِس مال یعنی باغ کی دل کشی کی وجہ سے ہوا ہے۔ چنانچہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور باغ میں اُن کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا، وہ آپؐ سے بیان کیا اور کہا کہ یا رسول اللہ میں یہ باغ اللہ کی راہ میں صدقہ دیتا ہوں آپ اسے جہاں چاہیں خرچ کریں۔

قرآن میں حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ جو مذکور ہے وہ بھی اسی قسم کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ قصہ یوں ہے کہ حضرت سلیمان ایک دفعہ اپنے گھوڑوں کو دیکھنے میں اس قدر مصروف تھے کہ نماز قضا ہو گئی۔ اس پر آپ نے گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے کا حکم دیا۔

اِن بلند مرتبہ احوال میں سے ایک حال اللہ کا خوف بھی ہے۔ اور اللہ کا یہ خوف اِس طرح ہونا چاہیے کہ اس کا اثر بدن اور جوارح پر ظاہر ہو۔

حفاظ حدیث نے اصول میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات شخص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے گا۔ حدیث میں ہے کہ آپ نے ان اشخاص کا ذکر کرتے کرتے آخر میں فرمایا کہ ان میں سے ایک شخص وہ ہوگا جس نے کہ اکیلے میں خدا کو یاد کیا۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک قبر پر کھڑے ہوئے۔ اور اتنا روئے کہ اُن کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ نیز احادیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز پڑھتے تھے تو آپؐ کے سینہ مبارک سے جوشِ گریہ کی وجہ سے ایسی آواز آتی تھی جیسے کہ آگ کے اُوپر دیگ چڑھی ہو۔

اِن احوال میں سے ایک رؤیائے صالحہ بھی ہے۔ اِس سلسلے میں حفاظ ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک مردِ صالح کا سچے خواب دیکھنا نبوت کا چھیالیسواں حصّہ ہے۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ میرے بعد نبوت تو ختم ہو جائے گی، البتہ "مبشرات" کا سلسلہ برابر قائم رہے گا۔ صحابہ رضؓ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! "مبشرات" کیا ہیں۔ فرمایا کہ رؤیائے صالحہ جو ایک نیکوکار آدمی خود دیکھتا ہے یا کوئی دوسرا اُس کے لیے دیکھتا ہے۔ یہ رؤیائے صالحہ نبوت کے چھیالیسویں حصے میں سے ایک ہے۔ چنانچہ یہی تفسیر ہے قرآن مجید کی اس آیت "لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" کی۔ یعنی بشارت ہے مومنوں کے لیے اِس دنیا کی زندگی میں۔

رؤیائے صالحہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو

یا بہشت و دوزخ کو یا نیکو کاروں اور انبیا کو یا متبرک مقامات مثلاً خانہ کعبہ، مسجدِ نبوی یا بیت المقدس کو خواب میں دیکھے۔ یا وہ مستقبل میں ہونے والے واقعات کو خواب میں دیکھے اور وہ بعد میں ویسے ہی رونما ہوں۔ یا وہ گزرے ہوئے واقعات کو بجنسہٖ اُسی شکل میں دیکھے، جس شکل میں کہ وہ وقوع پذیر ہو چکے ہیں۔ یا وہ انوار کو خواب میں دیکھے۔ یا پاکیزہ چیزوں کو جیسے دودھ کا پینا اور شہد اور گھی کا کھانا وغیرہ ہیں اور جن کا ذکر کتبِ حدیث کے بابِ رؤیا میں آچکا ہے، خواب میں دیکھے۔ یا وہ فرشتوں کو دیکھے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص ایک رات قرآن پڑھ رہا تھا کہ ایک سائبان ظاہر ہوا جس میں چراغوں کی روشنیاں تھیں ...... الخ

ان احوال میں سے سچی فراست اور واقعہ کے مطابق مناسب بات کا سوجھ جانا بھی ہے۔ حدیث میں آیا ہے "مومن کی فراست سے بچو کیونکہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ ان احوال میں سے ہی دعا کا قبول ہونا اور طالب اپنی پوری ہمت اور توجہ سے جو کچھ اللہ سے مانگ رہا ہو، اُس کا ظاہر ہونا بھی ہے۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے اُس حدیث کا جس میں آپؐ فرماتے ہیں بعض غبار آلود، پریشان حال اور پھٹے پرانے کپڑوں والے ہوتے ہیں کہ کوئی اُن کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن اگر وہ اللہ کے بھروسے پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ یقینی طور پر اُن کی قسم پوری کر دیتا ہے۔ الغرض یہ اور اس سے ملتے جلتے جو اَور احوال و واقعات ہیں، یہ سالک کے ایمان کی صحت، اس کی طاعات وعبادات کی قبولیت اور اس کے باطن میں نور کے سرایت کر جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ اِس لیے طالب کو چاہیے کہ وہ ایسے مواقع کو ہاتھ سے جانے نہ دے اور انہیں غنیمت سمجھے۔

اِس نسبت" کے حصول کے بعد اس سے ایک اور بلند تر مقام آتا ہے اور وہ مقام "فنا و بقا" یعنی اللہ کے وجود میں فنا ہو کر اس کے وجود کے ساتھ بقا حاصل کرنا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ مقامِ "فنا و بقا" کی کیفیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ تک سندِ متصل کے ذریعہ نہیں پہنچی۔ بلکہ یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک دَین ہے جس کو وہ چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے بغیر وراثت کے عطا کر دیتا ہے۔ اس بات کی شہادت خود خواجہ نقشبند کے اس قول سے بھی ملتی ہے، جب اُن سے اُن کے سلسلۂ مشائخ کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی شخص محض سلسلۂ مشائخ کے ذریعہ اللہ تک نہیں پہنچا۔ بلکہ اس معاملے میں ہوا یوں، کہ ایک کشش تھی جو مجھ پر اثر انداز ہوئی اور اُس نے مجھے اللہ تک پہنچا دیا۔ ان کے اس بیان کی تصدیق اِس قاعدہ کلیہ سے ہوتی ہے جو حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس قسم کی ایک کشش مساوی ہوتی ہے کُل جن و انس کے تمام اعمال کے۔ اِسی بنا پر خواجہ نقشبند نے اس امرِ واقعی کے باوجود کہ آپ کے مشائخ کا سلسلہ بہت مشہور و معروف تھا، یہ فرمایا کہ کوئی شخص محض سلسلۂ مشائخ کے ذریعہ اللہ تک نہیں پہنچا۔ الغرض جس شخص کو اس بلند تر مقام کی خواہش ہو، اُسے چاہیے کہ ہماری باقی کتابوں کی طرف رجوع کرے۔ اور سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کو صحیح راہ دکھانے والا ہے۔

والدِ بزرگوار کے ارشاد کردہ وظائف

والدِ بزرگوار قدس سرہ نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں پابندی سے ہر روز گیارہ سو بار یَا مُغْنِیُ اور چالیس بار سورۂ مزمل کا ورد کیا کروں۔ اگر سورۂ مزمل چالیس بار روز نہ پڑھ سکوں تو صرف گیارہ بار پڑھ لیا کروں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ دونوں وظیفے قلبی و ظاہری استغنا کے لیے مجرب ہیں۔ نیز والدِ بزرگوار نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں ہر روز پابندی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ بھیجا کروں۔ اِس سلسلے میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے، اِسی درود و صلوٰۃ سے حاصل کیا ہے۔

میں نے آپ کو یہ بھی فرماتے سُنا کہ اگر کوئی شخص تیرے پاس آئے اور اُس کے دانت میں یا اُس کے سر میں درد ہو رہا ہو۔ یا ریح اُس کو اذیت دے رہی ہو تو تم یوں کرو کہ ایک پاک تختی لو۔ اُس پر پاک ریتی ڈالو اور پھر کیل سے اَبْجَدْ هَوَّزْ حُطِّیْ د لکھو۔ اِس کے بعد ابجد کے الف پر کیل کو زور سے دباؤ اور سورۂ فاتحہ پڑھو۔ جس شخص کو درد ہو رہا ہے، وہ اپنی انگلی کو پوری قوت سے درد کی جگہ پر رکھے رہے۔ سورۂ فاتحہ پڑھ چکنے کے بعد اُس شخص سے پوچھو کہ کیا تمہیں افاقہ ہوا۔ اگر اُسے افاقہ ہو گیا ہو تو خیر، ورنہ کیل کو ابجد کے الف سے ب پر لے آؤ۔ اور سورۂ فاتحہ دوبارہ پڑھو۔ اور پہلے کی طرح پھر اُس سے پوچھو کہ کیا اُسے آرام آ گیا۔ اگر اُسے آرام آ گیا ہو تو خیر، ورنہ کیل کو ابجد کی جیم پر لے آؤ اور سورۂ فاتحہ تین بار پڑھو۔ پھر اس سے پوچھو۔ اگر آرام نہیں آیا تو کیل کو اگلے حرف پر لاؤ اور سورۂ فاتحہ

چار بار پڑھو۔ اس طرح ہر حرف پر سورۂ فاتحہ کو ایک ایک بار زیادہ پڑھتے ہوئے جب ابجد ہوز حطی کے آخری حرف پر پہنچ جاؤ گے تو امید ہے خدا تعالیٰ مریض کو درد سے شفا دے گا۔

میں نے اپنے والد کو فرماتے سنا ہے کہ جب تجھے کوئی حاجت پیش آئے یا تیرا کوئی آدمی غائب ہو گیا ہو اور تو چاہے کہ خدا تعالیٰ اسے صحیح سالم اور کامیاب واپس لائے یا تیرا کوئی بیمار ہو اور تو چاہے کہ خدا تعالیٰ اسے شفا دے تو فجر کی نماز کی سنتوں اور فرض کے درمیان اکتالیس بار سورۂ فاتحہ پڑھو۔ نیز میں نے یہ فرماتے سنا ہے کہ جس کو دیوانہ کتا کاٹ لے۔ اور ڈر ہو کہ کہیں وہ آدمی دیوانہ نہ ہو جائے تو تم آیت اِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَّ اَكِيدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا کو روٹی کے چالیس ٹکڑوں پر لکھو۔ اور سگ گزیدہ شخص کو کہو کہ وہ ہر روز ایک ٹکڑا کھا لیا کرے۔

میں نے والد بزرگوار کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص رات کو سورۂ واقعہ پڑھ لیا کرے، اس پر کبھی فاقے کی مصیبت نازل نہیں ہو گی۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جو شخص سوتے وقت سورہ کہف میں سے آیت "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" سے آخر سورہ تک پڑھے اور رات کی جس گھڑی وہ جاگنا چاہتا ہے، دعا کرے کہ خدا اسے اس گھڑی جگا دے تو اللہ تعالیٰ اسے اس گھڑی ضرور بیدار کر دے گا۔

میں نے والد بزرگوار کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اس تعویذ کو لکھ کر بچے کے گلے میں باندھ دو۔ خدا تعالیٰ اسے ہر شر سے محفوظ رکھے گا۔ وہ تعویذ یہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّعَيْنٍ لَامَّةٍ تَحَصَّنْتُ بِحِصْنِ

اَلْفُ اَلْفِ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔ میں نے انہیں یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو شخص صبح و شام یہ دعا پڑھے۔ وہ ہر آفت سے امان میں رہے گا۔ "بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَ اَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَآءْ لَمْ یَکُنْ اَشْھَدُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا وَ اَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَ مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ وَ اَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ اِنَّ وَلِیَّ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

میں نے والد بزرگوار کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جس شخص کو کسی صاحب حکومت کا خوف ہو تو کٓھٰیٰعٓصٓ کُفِیْتُ حٰمٓ عٓسٓقٓ حُمِیْتُ۔ کو اس طرح پڑھے کہ جب وہ "کٓھٰیٰعٓصٓ پڑھ رہا ہو تو ایک ایک حرف کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ کی ایک ایک انگلی بند کرتا جائے۔ اور اسی طرح حٰمٓ عٓسٓقٓ پڑھتے وقت بائیں ہاتھ کی ایک ایک انگلی بند کرتا جائے۔ پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو جس صاحب سے اُسے ڈر ہے اُس کے منہ کی طرف کر کے کھولے۔

نیز میں نے اُنہیں یہ فرماتے سُنا ہے کہ قرآنِ مجید کی یہ چھ آیات ہیں، جو "آیات الشفا" کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کو ایک برتن میں لکھ کر پانی سے گھولو اور پھر مریض کو پلا دو۔ وہ آیاتِ شفا یہ ہیں :-

وَ یَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِیْنَ۔ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی

الصُّدُوْرِ - يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ
فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ - وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ
رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ - وَ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ - قُلْ
هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ -

میں نے والد بزرگوار کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ تینتیس آیتیں ہیں جو ردِ سحر کے لیے مفید ہیں - اور آدمی شیطان، چوروں اور درندوں سے ان کی وجہ سے محفوظ رہتا ہے - چار آیات سورہٴ بقرہ کے شروع کی - آیتِ کرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں خَالِدُوْنَ تک - تین آیتیں سورہٴ بقرہ کے آخر کی - تین آیتیں سورہٴ اعراف کی - اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ سے مُحْسِنِيْنَ تک - بنی اسرائیل کی آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ سے آخر تک - دس آیات سورہٴ "الصافات" کی ابتدا سے لَازِبٍ" تک - دو آیتیں سورہٴ الرحمٰن کی يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ سے تَنْتَصِرَانِ تک - سورہٴ حشر کی آیت اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ سے آخر سورہ تک - اور دو آیتیں سورہٴ جن کی اَنَّهٗ" تَعَالٰى جَدُّ رَبِّنَا سے شَطَطًا تک - یہ کل تینتیس آیتیں ہوئیں - میرے والد تو ان پر سورہٴ فاتحہ، قُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ - قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور آخر کی دو سورتیں بھی اضافہ کر لیا کرتے تھے - اور وہ سورہٴ جن میں سے اول سے لے کر شَطَطًا تک پڑھتے تھے -

میں نے والد بزرگوار کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ چیچک کی بیماری ظاہر ہو تو نیلے رنگ کا دھاگا لو اور اس پر سورہٴ الرحمٰن پڑھو - پڑھتے پڑھتے جب فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پر پہنچو تو اس دھاگے میں ایک گرہ

لگاؤ اور اُس پر پھونک مارو۔ اِسی طرح برابر گرہیں لگاتے اور پھونک مارتے جاؤ۔ اِس کے بعد وہ دھاگا بچے کے گلے میں باندھ دو۔ خدا نے چاہا تو وہ چیچک سے آرام پائے گا۔ نیز میں نے اُن سے سُنا ہے کہ اصحاب کہف کے ناموں کا ورد پانی میں ڈوبنے، آگ میں جلنے، لُوٹ کھسوٹ اور چوری سے محفوظ رکھتا ہے۔ اور وہ یہ ہے "اِلٰھِی بِحُرْمَۃِ یَمْلِیْخَا مَکْسَلْمِیْنَا کَشْفُوْطَطْ اَذْرَ فَطْیُوْنُسْ کَشَافَطْیُوْنُسْ تَبْیُوْانُسْ یُوَانِسْ بُوْنُسْ وَکَلْبُھُمْ قِطْمِیْر وَعَلَی اللّٰہِ قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْھَا جَائِرٌ۔ نیز میں نے والد بزرگوار کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جب کوئی تجھے حاجت درپیش ہو تو یَا بَدِیْعَ الْعَجَائِبِ بِالْخَیْرِ یَا بَدِیْعُ بارہ دن تک روز بارہ سو مرتبہ پڑھو۔ خدا تعالیٰ ضرور تمہاری حاجت پوری کرے گا۔

وہ اوراد اور تعویذات جن کی مجھے والد بزرگوار نے اجازت دی تھی، ان میں سے چند ایک تو یہ ہیں جو اُوپر بیان ہوئے۔ مزید برآں اہم ضرورتوں کے لیے چاہیے کہ طالب چار رکعتیں پڑھے۔ اور پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ وَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ وَکَذٰلِکَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ سو مرتبہ پڑھے۔ دوسری رکعت میں رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ سو مرتبہ پڑھے۔ اور تیسری رکعت میں وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ سو مرتبہ پڑھے اور چوتھی رکعت میں قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ سو مرتبہ پڑھے۔ اس کے بعد سلام پھیرے اور رَبِّ اِنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ سو مرتبہ کہے۔

جو شخص شیطان کے آسیب سے پاگل ہو گیا ہو، اُس کے بائیں

کان میں سات بار وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمَانَ وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ پڑھ کر پھونکو۔ نیز اُس کے کان میں سات بار اذان دو۔ اور سورہ فاتحہ، سورہ فلق، سورہ والناس، آیۃ الکرسی، سورہ طارق، سورہ حشر کی آخر کی آیتیں اور سورہ الصافات پڑھو۔ یقیناً اِس سے شیطان جل جائے گا اس کے بعد سورہ مؤمنین میں سے اَفَحَسِبْتُمْ سے آخر سورہ تک پڑھ کر اس کے کان میں پھونکو۔ نیز پاک پانی لو۔ اس پر سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی اور سورہ جن کی پانچ آیتیں پڑھ کر پھونکو۔ اور اس پانی کو آسیب زدہ کے چہرہ پر چھڑکو۔ اِس سے اُسے ضرور افاقہ ہوگا۔ اگر یہ خیال ہو کہ کسی جگہ میں جن ہے تو اس پانی کو اُس جگہ پر چھڑکو۔ بے شک وہاں کبھی جن نہیں آئے گا کسی گھر میں شیطان کا آسیب ہو یا اس کے گھر پر پتھراؤ ہوتا ہو تو چار کیل لو، اور ان میں سے ہر ایک پر اِنَّهُمْ یَكِیْدُوْنَ كَیْدًا سے رُوَیْدًا تک کی آیات کو پچیس مرتبہ پڑھو۔ اور ان کیلوں کو گھر کے چار اطراف میں دفن کر دو۔ اسی غرض کے لیے اصحاب کہف کے نام گھر کی دیواروں پر لکھو۔

بانجھ عورت کے لیے آیت وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُیِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ سے لے کر جَمِیْعًا تک ہرن کی کھال پر زعفران اور گلاب کے پانی سے لکھو۔ اور اس کھال کو بانجھ عورت کے گلے میں باندھا جائے لونگ کے چالیس دانے لو۔ ان میں سے ہر ایک پر سات بار آیت کَظُلُمٰتٍ سے نُوْرٍ تک پڑھو۔ اور بانجھ عورت ہر روز لونگ کا ایک دانہ کھائے لیکن وہ غسل حیض سے فارغ ہونے کے بعد ان لونگوں کو کھانا شروع کرے۔ انہی ایام میں میاں بیوی آپس میں ہم بستری کریں۔

جس عورت کا بچہ ضائع ہو جاتا ہو۔ چاہیے کہ اس کے قد کے برابر زعفرانی رنگ کا دھاگا لیا جائے اور اس میں نو گرہیں لگائی جائیں۔ ان میں سے

ہر گرہ پر آیت وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ سے مُحْسِنُوْنَ تک اور سورہٗ قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھ کر پھونکی جائے۔ جس عورت کو بچہ جننے میں تکلیف ہو رہی ہو۔ اُس کے لیے ایک کاغذ پر وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ اِهْيًا اَشْرَاهِيًّا لکھا جائے۔ اور اس کاغذ کو پاک کپڑے میں باندھ کر اس عورت کی بائیں ران میں باندھا جائے، خدا نے چاہا تو بچہ جلد پیدا ہو جائے گا۔ میں نے اعمش کی کتاب "الدر المنثور" میں پڑھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دعا میں جو کلمہ استعمال کرتے تھے، اُس کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔

يَا حَيُّ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَيَا حَيُّ بَعْدَ كُلِّ شَيْءٍ

جس عورت کے ہاں صرف لڑکیاں ہی ہوتی ہوں اُس کے لیے ہرن کی کھال پر زعفران اور گلاب کے پانی سے اس آیت کو لکھا جائے "اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ"۔ نیز اس آیت کو يٰزَكَرِيَّا اِنَّا نُبَشِّرُكَ سے لے کر سَمِيًّا تک اور اس کے بعد "بِحَقِّ مَرْيَمَ وَعِيْسٰى ابْنًا صَالِحًا طَوِيْلَ الْعُمُرِ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ لکھے۔ اور وہ عورت حمل کے تین مہینے گزرنے سے پہلے اس کھال کو تعویذ بنا کر باندھے رکھے۔

وہ عورت جس کا لڑکا زندہ نہ رہتا ہو، اس کے بارے میں مجھے ایک شخص نے جس پر میں اعتماد کرتا ہوں، بتایا کہ اجوائن اور کالی مرچ لے کر پیر کے دن دوپہر کو اُن پر چالیس مرتبہ سورہ شمس پڑھی جائے۔ سورہ پڑھنے سے پہلے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا جائے۔ اور اسی طرح سورہ ختم کرنے پر بھی آپ پر درود و سلام بھیجا جائے۔ اِس کے بعد یہ

عورت اجوائن اور کالی مرچ حمل سے لے کر بچہ کا دودھ چھڑانے تک روز کھاتی رہے۔ نیز اُس نے مجھے بتایا کہ جس عورت کے ہاں صرف لڑکیاں ہی ہوتی ہوں، اُس کے پیٹ پر ستر بار گول خط کھینچا جائے اور انگلی سے خط کھینچتے وقت "یَا مَتِیْنُ" پڑھا جائے۔

یہاں ہم پھر اُن اوراد و تعویذات کا ذکر کرتے ہیں، جن کی اجازت ہمیں والدِ بزرگوار نے دی ہے جس بچے کو کسی عورت کی نظر لگ گئی ہو، اُس کے لیے چھری سے ایک دائرہ کھینچ کر آیت الکرسی کے بعد ان آیات کو پڑھا جائے۔ وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ وَ يَمْحُوا اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔ اس کے بعد کہے اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّآمَّاتِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّ هَامَّةٍ وَّ عَيْنِ الْلَّامَّةِ يَا حَفِيْظُ يَا رَقِيْبُ يَا وَكِيْلُ يَا كَفِيْلُ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اس کو پڑھنے کے بعد چھری کو دائرے کے وسط میں گاڑ دے۔ اور کہے رَكَزْتُهَا فِيْ قَلْبِ الْعَائِنَةِ" یعنی میں نے اس چھری کو نظر لگانے والی کے دل میں چبھو دیا۔ بعد ازاں اس چھری کو کسی طشتری یا قاب کے نیچے ڈھانک دیا جائے۔

اُسی شخص نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ اگر کوئی نظر لگانے والے یا جادوگر کو جب کہ نظر لگانے والا نظر لگا رہا ہو۔ یا جادوگر جادو کر رہا ہو۔ یا جب کہ وہ اپنی نظر اور جادو کا ذکر کر رہا ہو، کہے اے فلاں! اور اُس کا نام لے کر

اُس کو بلائے تو نظر لگانے والے اور جادوگر کا عمل باطل ہو جائے گا۔ نیز اُسی نے مجھے بتایا کہ جب نظر لگنے اور نظر لگانے والے کا پورا پتہ لگ جائے تو نظر لگانے والے کو کہا جائے کہ وہ اپنے چہرے، دونوں بازوؤں، دونوں پاؤں اور شرمگاہ کو کسی برتن میں دھوئے۔ اور اُس پانی کو جس شخص کو نظر لگی ہو اس پر چھڑکا جائے۔ اِس سے اُس شخص کو فوراً آرام ہو جائے گا۔ امام مالکؒ نے موطا میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے نظر لگانے والے کے بارے میں قریب قریب اِسی قسم کا ایک حکم نقل کیا ہے۔

اُسی شخص نے مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ نظر بد کے اثر کو دور کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک پاک دھاگے میں سے تین ہاتھ دھاگا ناپ لو۔ اُس دھاگے کو ایک شخص کی حفاظت میں رکھو۔ پھر اس دعا کو جس شخص کو نظر لگی ہے، اُس پر پڑھو اور دعا پڑھنے کے بعد دھاگے کو دوبارہ ناپو۔ اگر وہ دھاگا بڑھ گیا ہو یا کم ہو گیا ہو تو اُس شخص پر نظر کا اثر ہے۔ اس عمل کو تین بار کرو تو نظر کا اثر جاتا رہے گا۔ یہ دعا حسب ذیل ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کو تین بار پڑھے۔ پھر سورۃ فاتحہ کو تین بار پڑھے۔ پھر کہے عَزَمْتُ عَلَيْكِ اَيَّتُهَا الْعَيْنُ الَّتِيْ فِيْ فُلَانِ[1] ابْنِ فُلَانَةِ اَوْ فُلَانَةِ بِنْتِ فُلَانَةِ بِعِزِّ عِزِّ اللّٰهِ وَبِنُوْرِ عَظَمَةِ وَجْهِ اللّٰهِ بِمَا جَرٰى بِهِ الْقَلَمُ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِلٰى خَيْرِ خَلْقِ اللّٰهِ مُحَمَّدِ ابْنِ عَبْدِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَزَمْتُ عَلَيْكِ اَيَّتُهَا الْعَيْنُ الَّتِيْ فِيْ فُلَانِ ابْنِ

---

[1] فلان ابن فلانۃ یا فلانۃ بنت فلانۃ کی جگہ نظر لگنے والے یا لگنے والی کا نام لیا جائے۔ (مترجم)

فُلَانَةٍ بِحَقِّ اَشْرَاهِيًا بَرَاهِيًا اَذُونِيًا اَصْبَاتُ اِلٓ شَدَّاىْ عَزَمْتُ عَلَيْكِ اَيَّتُهَا الْعَيْنُ الَّتِي فِي فُلَانِ ابْنِ فُلَانَةٍ بِحَقِّ شَهْتَ بَهْتَ اِنْتَهَتْ يَا قَنْطَاعُ النَّجَا بِالَّذِي لَا يَقْوٰى عَلَيْهِ اَرْضٌ وَّلَا سَمَاءٌ دِ اخْرُجِي يَا نَفْسَ السُّوْءِ مِنْ فُلَانِ ابْنِ فُلَانَةٍ كَمَا اُخْرِجَ يُوْسُفُ مِنَ الْمَضِيْقِ وَ جُعِلَ لِمُوْسٰى فِي الْبَحْرِ طَرِيْقٌ وَ اِلَّا فَاَنْتِ بَرِيْئَةٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَ اللّٰهُ تَعَالٰى بَرِيْءٌ مِنْكِ اُخْرُجِي يَا نَفْسَ السُّوْءِ مِنْ فُلَانِ ابْنِ فُلَانَةٍ بِاَلْفِ اَلْفِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ اُخْرُجِي يَا نَفْسَ السُّوْءِ بِاَلْفِ اَلْفِ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَ اَصْحَابِهٖ وَ سَلَّمَ ۝

سحر زدہ اور اُس بیمار کو جس کی بیماری نے طبیبوں کو عاجز کر دیا ہو، سفید چینی کے برتن میں یَا حَیُّ حِیْنَ لَا حَیَّ فِیْ دَیْمُوْمَۃِ مُلْکِہٖ وَ بَقَآئِہٖ یَا حَیُّ لکھ کر اس کو پانی میں گھول کر چالیس دن تک پلایا جائے۔ اس ضمن میں میرا کہنا یہ ہے کہ میں نے والد بزرگوار کو دیکھا ہے کہ وہ اِس پر سورۂ فاتحہ کو بھی اضافہ فرمایا کرتے تھے جس شخص کی

کوئی چیز کھو جائے تو وہ پورے ایک سو انیس بار یَا حَفِیظُ کا وِرد کرے اس کے بعد آیت یَا بُنَیَّ اِنَّھَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ یَاْتِ بِھَا اللّٰہُ تک ایک سو انیس بار پڑھے۔ خدا تعالیٰ اُس کی کھوئی ہوئی چیز واپس لوٹا دے گا۔

چور کو معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھیں اپنے درمیان لوٹے کو اس طرح پکڑیں کہ وہ ان دونوں کی کلمے کی انگلیوں پر ٹکا ہوا ہو۔ اور جس شخص پر کہ چوری کا شک ہو، اُس کا نام لوٹے میں لکھا جائے اور سورۂ یٰسٓ شروع سے مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ تک پڑھی جائے۔ اگر چور وہی ہے، جس کا نام کہ لوٹے میں لکھا گیا ہے تو لوٹا گھوم جائے گا۔ اور اگر وہ نہ گھومے تو پہلے نام کو مٹا کر اُس کی جگہ دوسرا نام لکھا جائے۔ اور اسی طرح سورۂ یٰسٓ پڑھی جائے۔ یہ عمل برابر کرتے رہیں یہاں تک کہ لوٹا گھوم جائے۔

اس معاملے میں میری رائے یہ ہے کہ اگر اس طریقے سے چور کا پتہ لگ جائے تو اس کے چور ہونے پر قطعی طور سے یقین نہیں کر لینا چاہیے۔ اور نہ اس بنا پر اُس کے چور ہونے کی خبر کی دوسروں میں اشاعت کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کے لیے آثار و قرائن پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بھی ایک طریقہ آثار و قرائن پر نگاہ رکھنے کا ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید کے اس ارشاد کا خیال رکھنا چاہیے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "جس چیز کا تمہیں قطعی علم نہ ہو اس کے ہرگز پیچھے نہ پڑو"۔

جب تمہارا غلام بھاگ جائے تو اس کے لیے یہ کرو کہ ایک کاغذ پر سورۂ فاتحہ اور آیت الکرسی لکھنے کے بعد یہ دعا لکھو۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّی

اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَنْ فِيْهِنَّ فَاجْعَلِ اللّٰهُمَّ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا فِيْهَا عَلٰى عَبْدِكَ فُلَانِ ابْنِ فُلَانَةَ اَضْيَقَ مِنْ خَلْقِهٖ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلٰى مَوْلَاهُ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ - اس کے بعد اُسی کاغذ پر آیت اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ سے لے کر بَلْ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ لکھو - اور اِس کاغذ کو کسی چیز میں لپیٹ کر اسے اندھیرے کمرے میں دو پتھروں کے درمیان رکھو - اور ساتھ ساتھ یہ دُعا بھی پڑھو - اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ اَنْ تُصَلِّيَ عَلٰى نَبِيِّكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ وَاَنْ تَرُدَّ الْعَبْدَ اِلٰى مَوْلَاهُ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ -

اگر تم چاہو کہ خدا تعالیٰ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے تو سورۂ فاتحہ کو اس طرح پڑھو کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا آخری میم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے لام سے مل جائے - سورۂ فاتحہ کو اس طرح پڑھنا آیت وار سے شروع کرو - اور وہ اس طرح کہ پہلے دن صبح کی نماز کے فرضوں اور سنتوں کے درمیان ستر بار فاتحہ پڑھو دوسرے دن صرف ساٹھ با اور تیسرے دن پچاس بار - اسی طرح ہر روز دس دس بار گھٹاتے جاؤ - یہاں تک کہ ہفتہ کے دن صرف دس مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھنا رہ جائے -

اگر تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور چاہتے ہو کہ خواب میں اُس مصیبت کا حل دیکھ لو تو وضو کرو - پھر پاک کپڑے پہنو - دائیں کروٹ پر قبلے کی طرف مُنہ کر کے سو جاؤ اور سورۂ "والشمس" سورۂ "والیل" اور سورۂ "اخلاص" سات سات بار پڑھو - اور ایک روایت میں ہے

سورۂ "اخلاص" کے بجائے سورۂ "والتین"، سات بار پڑھو۔ اس کے بعد یہ دُعا مانگو۔ قُلِ اللّٰھُمَّ اَرِنِیْ فِیْ مَنَامِیْ کَذَا وَکَذَا وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ اَمْرِیْ فَرَجًا وَّمَخْرَجًا وَّ اَرِنِیْ فِیْ مَنَامِیْ مَا اَسْتَدِلُّ بِہٖ عَلٰی اِجَابَۃِ دَعْوَتِیْ۔ اگر خواب میں کوئی ایسی چیز نظر آجائے جس سے کہ تمہیں مسرت ہو تو خیر۔ ورنہ دوسری رات بھی ایسا ہی کرو۔ اگر پھر بھی مراد بر نہ آئے تو پھر تیسری رات اسی طرح کرو۔ اور اسی طرح سات راتوں تک برابر کرتے جاؤ۔ خدا نے چاہا تو اس سے زیادہ کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔ اس عمل کو ہمارے اصحاب کی ایک جماعت نے خود آزمایا ہے۔

جس شخص کو بخار آرہا ہو۔ اُس کے لیے یہ تعویذ لکھو۔ اور اس کے بازو پر باندھ دو۔ خُدا نے کیا تو بہت جلد بخار سے آرام آجائے گا وہ تعویذ یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ اِلٰی اُمِّ مِلْدَمٍ[1] الَّتِیْ تَاْکُلُ اللَّحْمَ وَتَشْرَبُ الدَّمَ وَتَھْشِمُ الْعَظْمَ اَمَّا بَعْدُ یَا اُمَّ مِلْدَمٍ اِنْ کُنْتِ مُؤْمِنَۃً فَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنْ کُنْتِ یَھُوْدِیَّۃً فَبِحَقِّ مُوْسَی الْکَلِیْمِ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاِنْ کُنْتِ نَصْرَانِیَّۃً فَبِحَقِّ الْمَسِیْحِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنْ لَّا اَکَلْتِ بِفُلَانِ ابْنِ فُلَانَۃٍ لَحْمًا وَّلَا شَرِبْتِ لَہٗ دَمًا وَّلَا ھَشَمْتِ لَہٗ عَظْمًا

---

[1] ام ملدم عربی میں بخار کی کنیت ہے۔

اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَنْ فِیْهِنَّ فَاجْعَلِ اللّٰهُمَّ السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَ مَا فِیْهَا عَلٰی عَبْدِكَ فُلَانِ ابْنِ فُلَانَةٍ اَضْیَقَ مِنْ خَلْقِهٖ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلٰی مَوْلَاهُ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔ اس کے بعد اُسی کاغذ پر آیت اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ سے لے کر بَلْ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ لکھو۔ اور اس کاغذ کو کسی چیز میں لپیٹ کر اسے اندھیرے کمرے میں دو پتھروں کے درمیان رکھو۔ اور ساتھ ساتھ یہ دُعا بھی پڑھو۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ هٰذِهِ الْاٰیَاتِ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی نَبِیِّكَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَ سَلَّمَ وَ اَنْ تَرُدَّ الْعَبْدَ اِلٰی مَوْلَاهُ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

اگر تم چاہو کہ خدا تعالیٰ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے تو سورۂ فاتحہ کو اس طرح پڑھو کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا آخری میم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے لام سے مل جائے۔ سورۂ فاتحہ کو اس طرح پڑھنا آیت وار سے شروع کرو۔ اور وہ اس طرح کہ پہلے دن صبح کی نماز کے فرضوں اور سنتوں کے درمیان ستر بار فاتحہ پڑھو دوسرے دن صرف ساٹھ بار اور تیسرے دن پچاس بار۔ اسی طرح ہر روز دس دس بار گھٹاتے جاؤ۔ یہاں تک کہ ہفتہ کے دن صرف دس مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھنا رہ جائے۔

اگر تم کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور چاہتے ہو کہ خواب میں اُس مصیبت کا حل دیکھ لو تو وضو کرو۔ پھر پاک کپڑے پہنو۔ دائیں کروٹ پر قبلے کی طرف مُنہ کر کے سو جاؤ اور سورۂ "والشمس" سورۂ "واللیل" اور سورۂ "اخلاص" سات سات بار پڑھو۔ اور ایک روایت میں ہے

سورۂ "اخلاص" کے بجائے سورۂ "والتین" سات بار پڑھو۔ اس کے بعد یہ دُعا مانگو۔ قُلِ اللّٰھُمَّ اَرِنِیْ فِیْ مَنَامِیْ کَذَا وَکَذَا وَاجْعَلْ لِیْ مِنْ اَمْرِیْ فَرَجًا وَّمَخْرَجًا وَّ اَرِنِیْ فِیْ مَنَامِیْ مَا اَسْتَدِلُّ بِہٖ عَلٰی اِجَابَۃِ دَعْوَتِیْ۔ اگر خواب میں کوئی ایسی چیز نظر آجائے جس سے کہ تمہیں مسرت ہو تو خیر۔ ورنہ دوسری رات بھی ایسا ہی کرو۔ اگر پھر بھی مراد بر نہ آئے تو پھر تیسری رات اسی طرح کرو۔ اور اسی طرح سات راتوں تک برابر کرتے جاؤ۔ خدا نے چاہا تو اس سے زیادہ کرنے کی نوبت نہ آئے گی۔ اس عمل کو ہمارے اصحاب کی ایک جماعت نے خود آزمایا ہے۔

جس شخص کو بخار آ رہا ہو۔ اُس کے لیے یہ تعویذ لکھو۔ اور اس کے بازو پر باندھ دو۔ خدا نے کیا تو بہت جلد بخار سے آرام آجائے گا وہ تعویذ یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بَرَآءَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ اِلٰی اُمِّ مِلْدَمٍ[1] الَّتِیْ تَاْکُلُ اللَّحْمَ وَتَشْرَبُ الدَّمَ وَتَھْشِمُ الْعَظْمَ اَمَّا بَعْدُ یَا اُمَّ مِلْدَمٍ اِنْ کُنْتِ مُؤْمِنَۃً فَبِحَقِّ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِنْ کُنْتِ یَھُوْدِیَّۃً فَبِحَقِّ مُوْسَی الْکَلِیْمِ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَاِنْ کُنْتِ نَصْرَانِیَّۃً فَبِحَقِّ الْمَسِیْحِ عِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنْ لَّا اَکَلْتِ بِفُلَانِ ابْنِ فُلَانَۃٍ لَحْمًا وَلَا شَرِبْتِ لَہٗ دَمًا وَلَا ھَشَمْتِ لَہٗ عَظْمًا

---

[1] ام ملدم عربی میں بخار کی کنیت ہے۔

وَ تَحَوَّلِیْ عَنْهُ اِلٰی مَنِ اتَّخَذَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ. وَاِلَّا فَاَنْتِ بَرِیْئَةٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ اللّٰهُ تَعَالٰی بَرِیْءٌ مِّنْكِ وَ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْلُ وَلَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَ صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ اٰلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَسَلَّمَ

نیز بخار کے لیے ہر روز نمازِ عصر کے بعد تین بار سورۂ مجادلہ پڑھے۔

جس شخص کو خنازیر کی شکایت ہو، وہ اپنے قد کے برابر ایک چمڑے کا تسمہ لے۔ اس میں اکتالیس گرہیں لگائے اور ہر گرہ پر یہ دعا پڑھ کر پھونکے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَعُوْذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ قُدْرَةِ اللّٰهِ وَقُوَّةِ اللّٰهِ وَعَظَمَةِ اللّٰهِ وَ بُرْهَانِ اللّٰهِ وَ سُلْطَانِ اللّٰهِ وَکَنَفِ اللّٰهِ وَ جِوَارِ اللّٰهِ وَاَمَانِ اللّٰهِ وَ حِرْزِ اللّٰهِ وَصُنْعِ اللّٰهِ وَکِبْرِیَآءِ اللّٰهِ وَ نَظَرِ اللّٰهِ وَ بَهَآءِ اللّٰهِ وَ جَلَالِ اللّٰهِ وَ کَمَالِ اللّٰهِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ،

جس شخص کے بدن پر سُرخ باد ظاہر ہو وہ سات بار یہ دُعا پڑھے۔ اور ساتھ ساتھ چھری سے سُرخ باد کی طرف اشارہ بھی کرتا جائے۔ وہ دُعا یہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِكْ وَ سَلِّمْ بِسْمِ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ الْحَکِیْمِ الْکَرِیْمِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَ قُدْرَتِهٖ وَ سُلْطَانِهٖ

اَیَّتُهَا الْحُمْرَةُ جَآءَتْكَ جُنُوْدٌ مِّنَ السَّمَآءِ وَقَالَ سُلَیْمَانُ اَیَّتُهَا الرِّیْحُ اَجِیْبِیْ دَاعِیَ اللّٰهِ وَمَنْ لَّمْ یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ فَمَا لَهٗ مِنْ مَّلْجَاءٍ وَّمَا لَهٗ مِنْ ظَهِیْرٍ بِسْمِ اللّٰهِ وَبِالثَّنَآءِ الطَّیِّبِ عَلَى اللّٰهِ اَللّٰهُ یَكْفِیْكَ وَاللّٰهُ یَشْفِیْكَ مِنْ كُلِّ دَآءٍ یُّؤْذِیْكَ وَمِنْ كُلِّ اٰفَةٍ تَعْتَرِیْكَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ -

جس شخص کو بصارت کی شکایت ہو، وہ ہر فرض نماز کے بعد یہ آیت پڑھے: "فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ"۔
اور جس شخص کو مرگی کے دورے پڑتے ہوں۔ وہ تانبے کی ایک تختی لے اور آیت وار کو دن نکلتے وقت اس کے ایک طرف یہ دعا "یَا قَهَّارُ اَنْتَ الَّذِیْ لَا یُطَاقُ اِنْتِقَامُهٗ یَا قَهَّارُ" اور اس کی دوسری طرف یہ دعا لکھے: یَا مُذِلَّ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ بِقَهْرِ عَزِیْزِ سُلْطَانِهٖ یَا مُذِلُّ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ وَالْمُعِیْنُ ٭

نویں فصل

عالمِ ربّانی کے آداب

اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے۔ "کیوں نہیں ہوتا ہر ہر گروہ سے چند لوگ ایسے نکلیں جو اچھی طرح سے دین کو سمجھیں اور پھر واپس جا کر اپنی قوم کو سمجھائیں۔ شائد ان کے سمجھانے سے ان کی قوم بُرائیوں سے بچ جائے۔" اس فرمودہ خداوندی کے مطابق عالمِ ربانی، جو انبیا اور مرسلین کا وارث ہوتا ہے، وہ ہے جو حسبِ ذیل امور کی حفاظت کرتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم دے۔ اور یہ تعلیم تفسیر، حدیث، فقہ، سلوک، عقائد اور نحو و صرف کی ہو۔ عالمِ ربّانی کو علمِ کلام و اصول اور منطق میں مشغول نہیں ہونا چاہیے۔ اِسی سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "وہی ذاتِ خداوندی ہے۔ جس نے ان پڑھوں کی طرف ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو اُن پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے۔ ان کے اخلاق سدھارتا ہے۔ اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

تعلیم و تدریس میں عالمِ ربّانی کو ان باتوں کی مراعات کرنا ضروری

ہے۔ اگر کتاب میں کوئی نا مانوس لفظ آجائے تو وہ اُس کی لغت سے وضاحت کرے۔ اگر کوئی دشوار صیغہ یا مشکل ترکیب ہو تو اُس کی صرف نحو کی مدد سے تشریح کر دے۔ مسائل کے بیان میں وہ جزوی مثالیں پیش کرے اور ان کا حاصل مقصود سمجھائے۔ اپنے مطلب کو ذہن نشین کرانے کے لیے اِس طرح استدلال کرے کہ دلیل کے مقدمات میں سے ایک مقدمہ کا دوسرے کے ساتھ لزوم ہو۔ اور ایک دوسرے کے اندر مندرج ہو۔ تاکہ اس کی وجہ سے جو نتیجہ نکالنا منظور ہے، وہ جلد نظروں کے سامنے آجائے۔ چیزوں کی تعریف اور قاعدے کلیوں میں جو شرطیں اور قیود عائد کی جاتی ہیں، عالم کو چاہیے کہ تعلیم دیتے وقت وہ اِن شرطوں اور قیود کی تشریح کرتا جائے۔ تقسیمات میں حاصل مقصود کو جس طرح حصر کیا جاتا ہے، اِس کے وہ وجوہ بھی بتلائے۔ اور مختلف مسلکوں، توجیہوں اور عبارتوں میں جب دو چیزیں ایک دوسرے سے مشابہ ہوں لیکن بظاہر مختلف نظر آتی ہوں۔ یا در اصل مختلف ہوں لیکن دیکھنے میں مشابہ ہوں۔ اِس سلسلے میں ظاہر میں جو شبہے ہوتے ہیں، وہ ان کو دور کرے۔ اِسی طرح وہ باتیں جن کا ممتنع ہونا لازم ہے۔ جیسے تعریف میں استدراک، خفی تر کا ذکر اور بُرہان میں کبریٰ کی جزئیت اور صغریٰ کی سالبیت، ان کے متعلق بظاہر جو شبہے ہوں، ان کو رَدّ کرے۔ عالم ربانی جب تک اِن امور کو اچھی طرح بیان نہ کرے۔ پھر تعلیم دیتے ہوئے جب تک وہ اُن کی طرف برابر شاگردوں کو متنبہ نہ کرتا رہے، اس وقت تک وہ شاگردوں کو پوری طرح مستفید نہیں کر سکتا۔

دوسری چیز جس کی حفاظت عالم ربانی کے ذمے ہے، وہ یہ ہے کہ وہ طریقت کے اشغال کی تلقین کرے۔ اِس موضوع کو ہم بڑی تفصیل سے پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ عالم ربانی کو چاہیے کہ وہ اِس کام کے لیے ایک وقت مقرر کرے جس میں وہ لوگوں کے پاس بیٹھے۔ اُن پر "توجہ" ڈالے۔ اور اُن پر "نسبتِ سکینہ" کا القا کرے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حُجت کے اتمام کے لیے ایک تو جتنی ممکن استطاعت ہو، وہ ضروری ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد جتنی بھی استطاعت انسان سے میسر آسکے۔ استطاعتِ میسرہ میں سے ایک تو صحبت ہے۔ اور دوسرے اشغالِ طریقت پر قولاً و فعلاً اور دِل پر اپنا اثر ڈال کے طالب کو آمادہ کرنا ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔ قرآن مجید میں یُزَکِّیھِمْ میں اِسی طرف اشارہ ہے۔

اِن امور میں سے تیسری بات یہ ہے کہ عالم ربانی اپنے متوسلین کو برابر وعظ و نصیحت کرتا رہے۔ اِسی ضمن میں اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اپنے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے "نصیحت کر، اگر نصیحت کرنا لوگوں کے لیے مفید ہے"۔ عالم ربانی کو چاہیے کہ وعظ و نصیحت میں وہ قصہ گوئی سے اجتناب کرے۔ کتبِ حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ رض لوگوں کو برابر وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ سنن ابن ماجہ وغیرہ میں یہ روایت بھی ہے کہ قصہ گوئی کا رواج نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا۔ نہ ابوبکر رض اور عمر رض کے زمانے میں۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ صحابہ قصہ گوؤں کو مساجد سے نکال دیا کرتے تھے۔ غرضیکہ اِن احادیث

سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قصّہ گوئی وعظ و نصیحت، کے ذیل میں نہیں آتی ۔ اور یہ کہ قصّہ گوئی مذموم اور وعظ و نصیحت پسندیدہ۔

قصّہ گوئی یہ ہے کہ عجیب عجیب نادر حکایات بیان کی جائیں اور اِس طرح کی دوسری چیزوں کے فضائل میں خلافِ واقعہ مبالغہ کیا جائے ۔ ان فضائل کے بیان کرنے سے قصّہ گو کا مقصد لوگوں کو بتدریج سنت کی تلقین کرنا اور آہستہ آہستہ اُن کو اس کا خوگر بنانا نہ ہو بلکہ وہ محض اپنا زورِ بیان دکھانے، کلام میں جدّت پیدا کرنے، لوگوں میں فصاحت کی بنا پر ممتاز ہونے اور طرح طرح کی حکایتوں اور امثال کو اچھی طرح بیان کرنے کی غرض سے اس طرح کا مبالغہ کرے ۔ الغرض وعظ و نصیحت اور قصہ گوئی میں فرق کرنا بڑا ضروری ہے ۔ آگے چل کر ہم اِس مسئلے پر مستقلاً ایک فصل میں بحث کریں گے۔

وہ امور جن کی حفاظت عالمِ ربانی کے ذمے ہے، اُن میں سے چوتھا کام وضو اور نماز کے معاملے میں "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے ۔ مثلاً وہ ایک شخص کو دیکھتا ہے کہ اُس نے وضو کرتے وقت پاؤں اچھی طرح نہیں دھوئے تو اُسے چاہیے کہ بلند آواز سے کہے "۔ ایڑیوں کے لیے عذاب ہے دوزخ کا"۔ یا ایک اَور شخص ہے کہ وہ نماز کے ارکان پوری طمانیت سے ادا نہیں کرتا ۔ عالمِ ربانی اُسے کہے کہ "دوبارہ نماز پڑھو کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی"۔ اِسی طرح وہ لباس، گفتگو اور دوسرے معاملات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عامل ہو۔ اِسی سلسلے میں خدا تعالیٰ قرآنِ مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ "تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے ۔ وہ انہیں اچھے کاموں کا حکم دے ۔ اور بُرے کاموں سے اُن کو روکے ۔ واقعہ یہ ہے

کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں": امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے نرمی اور ملائمت ضروری چیز ہے۔ بات یہ ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ اور سختی تو اُمرا اور بادشاہوں ہی کی شان ہو سکتی ہے۔ اِس بارے میں ارشادِ خداوندی ہے "اے پیغمبر! تم مخالفوں سے بحث کرو تو اس طریق سے کرو جو سب سے اچھا ہے"۔

عالِم ربانی کا پانچواں فریضہ یہ ہے کہ جہاں تک اِس کے بس میں ہو، وہ فقرا اور طالب علموں کی خبر گیری کرے۔ اور خود اس میں اتنی استطاعت نہ ہو تو اپنے متوسلین اور ہم خیالوں کو اُن کی خبر گیری کرنے پر ابھارے۔ اور اُنہیں اِس پر آمادہ کرے۔

اب اگر کسی ایک شخص میں یہ پانچوں صفتیں جمع ہو جائیں تو تمہیں اِس میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ یہی وہ شخص ہے جو انبیا اور مرسلین کا وارث ہے۔ بے شک یہ وہی ہے جو عالمِ ملکوت میں "عظیم" کے لقب سے پکارا جائے گا۔ اور اِسی کے لیے اللہ کی خلقت ہمیشہ ہمیشہ جب تک جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، مچھلیاں پانی میں ہیں، دعا مانگتی رہے گی۔ اگر کبھی تمہیں ایسا شخص مل جائے تو اس کی صحبت کو اپنے لیے لازم پکڑنا۔ اور کبھی ایسا نہ ہو کہ تم اس سے محروم ہو جاؤ۔ کیونکہ ایسا شخص تو کبریتِ احمر یعنی اکسیرِ اعظم ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔

اِس ضمن میں تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایک شخص اگر رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز ہے۔ پھر یہ جو پانچ امور بیان ہوئے، ان میں سے کسی امر میں وہ پورا نہیں اُترتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں اُس میں یہ نقص ہے اور جب تک وہ اس کی تلافی

نہیں کرے گا، وہ ناقص ہی رہے گا۔

راہِ حق کے طالب کو میں یہاں چند امور کی وصیت کرتا ہوں:۔

ایک یہ کہ وہ دولت مندوں کی صحبت اختیار نہ کرے، سوائے اس کے کہ وہ اس ذریعہ سے لوگوں پر جو مظالم ہوتے ہوں اُن کو روکنا چاہے۔ یا دولت مندوں کو وہ اس طرح نیک کاموں پر آمادہ کرنا چاہتا ہو۔ دولت مندوں کی صحبت اختیار کرنے کی یہی ایک وجہ ہو سکتی ہے، جس کی بنا پر اُن احادیث میں جو بادشاہوں کی صحبت اختیار کرنے کو بُرا قرار دیتی ہیں۔ اور اس امر میں کہ بہت سے صالح و نیکوکار علما برابر بادشاہوں کی صحبت اختیار کرتے رہے ہیں، مطابقت ہو سکتی ہے۔

طالب راہِ حق کو میری دوسری وصیت یہ ہے کہ وہ جاہل صوفیوں، جاہل عبادت گزاروں، خشک مزاج فقیہوں، ظاہر پرست محدثوں اور حد سے بڑھے ہوئے معقولیوں کی صحبت میں نہ بیٹھے۔ اس کے برعکس وہ صاحب علم صوفی اور زاہد ہو۔ ہر دم اللہ کی طرف توجہ کرنے والا ہو۔ معرفت کے احوال کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو۔ سنت کی طرف راغب ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کی تلاش میں رہنے۔ وہ محقق فقہا جو قیاس و رائے کے مقابلہ میں حدیث کی طرف زیادہ مائل ہیں، وہ علما جن کے عقائد سنت سے ماخوذ ہیں۔ اور وہ عقلی استدلال کو ایک زائد سی چیز سمجھتے ہیں۔ اور وہ اصحاب سلوک جو جامع ہیں علم اور تصوف کے، اور بلا وجہ اپنے اوپر سختی نہیں کرتے۔ اور نہ ضرورت سے زیادہ سنت میں دقت پسندی سے کام لیتے ہیں۔ طالبِ حق کو چاہیے کہ ان فقہا، ان علما اور ان اصحاب سلوک کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے آثار کی وضاحت اور

تفصیل دیکھے۔

راہِ حق کے طالب کو چاہیے کہ وہ فقہ کے کسی ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح دینے کے بارے میں گفتگو نہ کرے بلکہ ان سب مذاہب کو وہ ایک ہی درجۂ قبولیت پر رکھے۔ ان میں سے اُس مذہب پر چلے جو اُس کے نزدیک واضح اور مشہور سنت کے مطابق ہے اور اگر کسی مسئلے میں دو قول ہوں اور دونوں کے دونوں سنت سے مستنبط ہوں تو جس قول پر فقہا کی اکثریت ہو، اُس کو لے لے لیکن اگر دونوں کو ماننے والے برابر برابر ہوں تو طالب کو اختیار ہے کہ جسے چاہے اختیار کرے۔ اُسے چاہیے کہ فقہ کے ان سب مذاہب کو یوں سمجھے، جیسے کہ یہ ایک مذہب ہے۔ اور اس معاملے میں وہ ہرگز تعصب نہ برتے۔

طالبِ راہِ حق کو میری آخری وصیت یہ ہے کہ وہ تصوف کے ایک طریقے کو دوسرے طریقے پر ترجیح دینے کے متعلق بحث نہ کرے۔ صوفیا میں سے جو لوگ مغلوب الحال ہیں نہ تو وہ اُن کو بُرا سمجھے اور نہ اُن کو جو سماع وغیرہ امور میں تاویل کرنے والے ہیں۔ اور جہاں تک اُس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ سوائے اُس راہ کے جو سنت سے ثابت ہے۔ اور اہلِ علم میں محققین اور راسخین کا گروہ اس پر عامل ہے، کسی اَور پر نہ چلے۔ باقی توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا تو اللہ ہی ہے +

وعظ و تذکیر کے آداب

اللہ تعالیٰ اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے "فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ" یعنی اے پیغمبر! تو لوگوں کو وعظ و نصیحت کر۔ بے شک تو وعظ و نصیحت کرنے والا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بھی ارشاد فرمایا: وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ" یعنی اے موسیٰ تو ان لوگوں کو گزرے ہوئے وقائع یاد دلا اور ان کو وعظ و نصیحت کر۔ اس سے ثابت ہوا کہ تذکیر یعنی وعظ و نصیحت دین کا ایک بڑا رکن ہے۔ یہاں ہم وعظ و نصیحت کرنے والے کے اوصاف، وعظ و نصیحت کرنے کی کیفیت، وعظ کے پیش نظر مقصد، واعظ کس کس علم سے وعظ میں مدد لے، وعظ کے فن کے ارکان، وعظ سننے والوں کے آداب اور آج اس زمانے میں واعظ کن کن عارضوں میں گرفتار ہیں، ان امور پر گفت گو کرتے ہیں۔ اور اس معاملے میں صرف اللہ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔

واعظ کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ مکلّف یعنی عاقل و بالغ اور عادل ہو۔ جیسا کہ اہل علم نے حدیث کے راوی اور گواہی

دینے والے کے لیے مکلف اور عادل کی شرط لگائی ہے ۔ وہ محدّث ہو ۔ مفسّر ہو ۔ اور سلف صالحین کے حالات اور اُن کی سیرت کا کافی حد تک عالم ہو ۔ محدّث سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ حدیث کے مطالعہ میں مصروف رہا ہو ۔ اور وہ اس طرح کہ اُس نے احادیث کے الفاظ کو پڑھا ہو ۔ اُن کے معانی کو سمجھا ہو ۔ اور ان میں سے صحیح اور ضعیف کو جانا ہو ۔ خواہ احادیث میں صحیح اور ضعیف کا یہ علم اس کو کسی حافظِ حدیث کی روایت یا کسی فقیہ کے استنباط سے ہی حاصل ہوا ہو ۔ مفسر سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کے غریب الفاظ کی شرح ، اس کے مشکل مقامات کی توجیہ ، اور سلف سے تفسیر میں جو کچھ مروی ہے ، ان سب کا مطالعہ کر چکا ہو ۔ اِن سب اوصاف کے ساتھ ساتھ وہ فصیح بھی ہو ۔ اور لوگوں سے ان کی سمجھ کے مطابق بات کرے ۔ نیز اُس کے مزاج میں لطافت ہو اور وہ وجاہت اور مروت رکھتا ہو ۔

باقی رہا وعظ و نصیحت کرنے کا طریقہ ۔ سو واعظ کو کچھ دن ناغہ کر کے وعظ کہنا چاہیے ۔ جب وہ دیکھے کہ سننے والوں میں ملال و افسردگی ہے تو وعظ نہ کہے ۔ بلکہ وہ اُس وقت وعظ کہے ، جب سننے والوں میں رغبت و شوق دیکھے ۔ اُن میں رغبت و شوق ہنوز باقی ہی ہو کہ وہ وعظ ختم کر دے ۔ وعظ کہنے کے لیے واعظ کو پاک جگہ میں جیسے کہ مسجد ہے ، بیٹھنا چاہیے ۔ وہ خدا کی تعریف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام سے وعظ شروع کرے ۔ اور اِسی پر اسے ختم بھی کرے ۔ اور عام مومنوں کے لیے بالعموم اور حاضرین کے لیے بالخصوص دُعا مانگے ۔

وعظ میں نہ تو صرف شوق و رغبت کی باتیں ہوں ۔ اور نہ تمام تر

ڈرانا اور دھمکانا ہی ہو۔ بلکہ واعظ کو چاہیے کہ وہ ترغیب و ترہیب دونوں کو اپنے وعظ میں جگہ دے۔ جیسے کہ خود قرآنِ مجید میں ہے کہ وعدہ کے بعد وعید کا ذکر ہے۔ اور خوش خبری کے بعد عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ واعظ کے لیے ضروری ہے کہ وہ آسانی پیدا کرنے والا ہو نہ کہ سختی کرنے والا۔ اُسے چاہیے کہ وہ وعظ میں اپنا خطاب عام رکھے۔ اور خطاب کرتے وقت ایک گروہ کو چھوڑ کر دوسرے گروہ کو مخصوص نہ کرے۔ نہ وہ بالمشافہ کسی جماعت کی مذمت کرے اور نہ وعظ میں کسی خاص شخص کو بُرا کہے۔ بلکہ اگر کسی کو اُسے کچھ کہنا ہو تو اس طرح اشارۃً کہے "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسے ایسے کام کرتے ہیں" وعظ میں کوئی خفیف یا بے ہودہ بات نہ کہنی چاہیے۔ جو اچھی چیز ہے اُس کو اچھی کہے۔ اور جو بُری ہے اُس کو بُرا بتائے اور نیک کاموں کا حکم دے۔ بُرے کاموں سے منع کرے۔ واعظ کو ہرجائی نہیں ہونا چاہیے کہ جیسا رنگ دیکھے ویسی ہی باتیں کرنے لگے۔

اب رہا یہ سوال کہ وعظ کی غرض و غایت کیا ہے؟ اِس معاملے میں سب سے پہلے واعظ کو چاہیے کہ اپنے دل میں ایک مسلمان کے اوصاف کا تصور کرے۔ یعنی یہ کہ ایک مسلمان کے اعمال کیسے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو کس طرح قابو میں رکھتا ہے۔ اُس کے اخلاق اور اُس کی قلبی کیفیات کیسی ہوتی ہیں اور کس طرح وہ برابر ذکر و اذکار کرتا رہتا ہے۔ واعظ جب ان اوصاف کا اپنے دل میں اچھی طرح سے تصور کر لے تو پھر اس کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اپنے وعظوں کے ذریعہ سامعین کی زندگیوں میں آہستہ آہستہ اُن کی سمجھ کے مطابق ان کے اوصاف کو پوری طرح عملی جامہ پہنائے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو وہ لباس

اور وضع قطع کی جو اچھائیاں اور برائیاں ہیں، وہ لوگوں کو بتائے اور اچھائیاں اختیار کرنے اور نماز پڑھنے کا اُنھیں حکم دے۔ جب وہ ان چیزوں کے عادی ہو جائیں تو وہ انہیں ذکر واذکار کرنے کا کہے۔ اور جب اُن پر ذکرواذکار کا اثر ہو جائے تو وہ انہیں اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اپنی زبانوں اور دلوں پر ضبط کرنا سیکھیں۔

اِس سلسلے میں واعظ کو یہ کرنا چاہیئے کہ سامعین کے دلوں میں تاثیر ڈالنے کے لیے "ایّام اللہ" یعنی گزرے ہوئے واقعات، اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے کاموں، اس کی قدرت کے تصرفات، دنیا کی قوموں پر عذابوں کے نازل ہونے، پھر موت کی دہشت، قبر کے عذاب، یومِ حساب کی سختی اور دوزخ کے عذاب کا ذکر کرے۔ اور ساتھ ہی جیسا کہ ہم ابھی ابھی بیان کر آئے ہیں، اچھے کاموں کے بدلے آخرت میں جو نعمتیں ملیں گی، اُن کو بھی بیان کرے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ واعظ وعظ میں کن کن علوم سے مدد لے؟۔ واعظ کو چاہیئے کہ وہ قرآن کا جو صاف اور واضح مفہوم ہے، اُس سے احادیث جو محدثین کے نزدیک معروف ومشہور ہیں، اُن سے۔ اور صحابہ تابعین اور ان کے علاوہ جو اور صالح مومن ہیں، ان کے آثار و اقوال سے۔ وعظ میں مدد لے۔ نیز وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی وعظ میں بیان کرے۔ واعظ کو اپنے وعظ میں غلط سلط قصے بیان نہیں کرنا چاہئیں۔ صحابہ رضہ اِس بات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اُنھوں نے ایسے لوگوں کو مسجدوں سے نکال دیا اور انہیں مارا بھی تھا۔ اِس قسم کے غلط سلط قصے زیادہ تر اسرائیلی روایات جن کا صحیح ہونا معلوم نہیں اور سیرتِ نبوی اور آیاتِ قرآن کے شانِ نزول کے متعلق بیان کیے

جاتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ وعظ کے ارکان کیا ہیں؟ سو واعظ کو چاہیے کہ وہ وعظ میں اچھے کاموں کی رغبت دلائے۔ بُرے کاموں سے ڈرائے۔ اپنی بات کو آسان مثالوں سے واضح کرے۔ اور رقّت پیدا کرنے والے قصے اور مفید نکتے بیان کرے۔ الغرض یہ طریقہ ہے وعظ و نصیحت کا۔ اگر واعظ کسی ایسے مسئلے کا ذکر کرنا چاہے۔ جس میں اُسے بتانا ہو کہ یہ چیز حلال ہے یا حرام۔ یا وہ آداب تصوف، دعاؤں یا عقائد کی کوئی بات کرے، تو سچ یہ ہے کہ پہلے اُسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اس مسئلے سے اور اس مسئلے کو صحیح طور پر تعلیم دینے کے طریقے سے واقف ہے یا نہیں۔

واعظ کے لیے جو ضروری شرائط ہیں، ان کا تو بیان ختم ہو گیا۔ وعظ سننے والوں کے آداب یہ ہیں کہ وہ وعظ میں واعظ کی طرف متوجہ ہوں۔ دورانِ وعظ نہ تو کسی کھیل میں لگیں۔ اور نہ شور و غوغا مچائیں نہ آپس میں باتیں کریں اور نہ ہر مسئلے کے متعلق واعظ سے زیادہ سوال کریں۔ بلکہ اگر وعظ کے دوران کوئی سوال دماغ میں آ بھی جائے تو بہتر یہ ہے کہ اگر اُس کا تعلق وعظ کے موضوع سے زیادہ قوی نہ ہو۔ یا یہ سوال اتنا دقیق ہو کہ عام لوگ اس کو سمجھ نہ سکتے ہوں تو اس سلسلے میں چپ رہا جائے۔ اور اگر اس سوال کا پوچھنا ضروری ہی ہو تو واعظ سے خلوت میں پوچھ لیا جائے۔ لیکن اگر وعظ کے موضوع سے اس سوال کا قوی تعلق ہے۔ اور وہ اس طرح کہ واعظ نے کوئی بات اجمالاً کہہ دی اور سننے والا اس کی تفصیل چاہتا ہے۔ یا کوئی غیر مانوس چیز ہے اور سننے والے کو اس کی تشریح چاہیے تو اس معاملے میں مناسب

یہ ہے کہ وہ واعظ کو اپنی بات ختم کرنے دے اور پھر اُس سے سوال کرے۔

واعظ کو چاہیے کہ وہ اپنی بات تین بار دُہرائے۔ اگر وعظ میں مختلف زبانیں جاننے والے لوگ ہوں۔ اور واعظ یہ زبانیں جانتا ہو تو اُسے ان زبانوں میں بھی اپنی بات کہنی چاہیے۔ اِس کے علاوہ واعظ کو وعظ میں دقیق اور اجمالی باتیں کہنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اِس زمانے میں ہمارے واعظ جن آفتوں میں مبتلا ہیں، اُن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ صحیح اور موضوع روایات میں تمیز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ان کے وعظ کا غالب حصّہ موضوع اور تحریف شدہ باتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ نیز وہ بیشتر ان نمازوں اور دعاؤں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو محدثین نے موضوع یعنی بعد کی گھڑی ہوئی روایات قرار دیا ہے۔ ہمارے واعظوں کی ان آفتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اچھے کاموں کے ثواب اور بُرے کاموں کی پاداش کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اور ایک آفت یہ ہے کہ وہ واقعۂ کربلا، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور اس طرح کے واقعات کے متعلق وعظوں میں بہت قصّے بیان کرتے ہیں۔ اور انہیں کا خطبوں میں زیادہ تر ذکر بھی کرتے ہیں۔

گیارھویں فصل

مُصنّف کا سلسلۂ طریقت

تصوف میں ہمارا سلسلۂ صحبت اور طریقت و سلوک کے آداب میں ہمارے اخذِ علم کا واسطہ صحیح، مشہور اور متصل روایت کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملتا ہے۔ گو تصوف کے ان مخصوص آداب اور اشغال کا تعین آپؐ سے ثابت نہیں۔ اِس بندۂ ضعیف ولی اللہ نے خدا اسے مغفرت کرے۔ اور اُسے اپنے پیش رو صالحین سے ملائے، اپنے والد شیخ اجل عبد الرحیم کی صحبت سے، اللہ اُن سے راضی ہو اور اُن کو راضی رکھے، ایک طویل مدّت تک فیض حاصل کیا۔ ان سے میں نے ظاہری علوم پڑھے۔ اور طریقت کے آداب سیکھے۔ اِس بندۂ ضعیف نے ان کی کرامات دیکھیں۔ ان سے مشکلات کے حل پوچھے۔ اور طریقت و حقیقت اور واقعات و احوال و کرامات کی قبیل میں سے جو کچھ ان پر اور اُن کے مشائخ پر گزرا تھا، اُن امور کے بارے میں ان سے بہت کچھ سُنا۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ موصوف کو میری طرف سے اور جو دوسرے استفادہ کرنے والے ہیں، اُن کی طرف سے جزائے خیر دے۔

بندۂ ضعیف نے اپنے والد شیخ عبد الرحیم کی صحبت پائی۔ اور والدِ بزرگوار بہت سے مشائخ کی صحبت سے مستفید ہوئے، جن میں سے یہ تین بڑے جلیل القدر ہیں۔ اول خواجہ خورد جو شیخ احمد سرہندی، شیخ الہ داد اور خواجہ حسام الدین کے صحبت یافتہ تھے۔ اور یہ تینوں کے تینوں خواجہ خرد کے والد خواجہ محمد باقی باللہ کے صحبت یافتہ تھے۔ شیخ عبد الرحیم کے مشائخ میں سے دوسرے بزرگ شیخ عبد اللہ ہیں، جو شیخ آدم بنوری کے صحبت یافتہ تھے۔ انہیں شیخ احمد سرہندی کی صحبت ملی تھی۔ اور شیخ

احمد سرہندی خواجہ محمد باقی باللہ کے صحبت یافتہ تھے۔ شیخ عبدالرحیم کے تیسرے شیخ خلیفہ ابوالقاسم ہیں، جنہوں نے ملّا ولی محمد کی صحبت پائی اور وہ امیر ابوالعلا کی صحبت میں بیٹھے تھے۔

خواجہ محمد باقی باللہ نے خواجہ امکنگی کی صحبت پائی۔ وہ اپنے والد مولانا محمد درویش سے فیض یاب ہوئے۔ مولانا محمد درویش، مولانا محمد زاہد کی صحبت میں بیٹھے۔ اور مولانا محمد زاہد نے خواجہ عبیداللہ احرار کی صحبت پائی۔

اسی طرح امیر ابوالعلا امیر عبداللہ کی صحبت میں بیٹھے انہوں نے امیر یحییٰ سے فیض پایا۔ امیر یحییٰ نے خواجہ عبدالحق سے فیض حاصل کیا اور وہ خواجہ عبیداللہ احرار کے صحبت یافتہ تھے۔

خواجہ عبیداللہ احرار نے کئی اور بزرگوں کی صحبت پائی، جن میں سے مشہور مولانا یعقوب چرخی اور خواجہ علاؤالدین غجدوانی ہیں۔ یہ دونوں کے دونوں خواجہ نقشبند سے بلا واسطہ مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ مولانا یعقوب چرخی نے خواجہ علاؤالدین عطار کی بھی صحبت پائی۔ اسی طرح خواجہ علاؤالدین غجدوانی محمد پارسا کی صحبت میں بیٹھے۔ اور خواجہ علاؤالدین عطار اور خواجہ محمد پارسا دونوں خواجہ نقشبند کے جلیل القدر اصحاب میں سے تھے۔

خواجہ نقشبند نے بہت سے بزرگوں کی صحبت پائی، جن میں سے سب سے زیادہ جلیل القدر خواجہ محمد سماسی اور اُن کے خلیفہ امیر سید کلال ہیں۔ خواجہ محمد سماسی نے خواجہ علی رامیتنی سے فیض پایا۔ انہوں نے خواجہ محمود ابوالخیر فغنوی سے۔ انہوں نے خواجہ عارف ریوگری سے۔ وہ خواجہ عبدالخالق غجدوانی کی صحبت میں بیٹھے۔ انہوں

نے خواجہ یوسف ہمدانی سے فیض پایا اور وہ علی فارمدی کے صحبت یافتہ تھے۔

علی فارمدی کے بہت سے مشائخ تھے، جن میں سے یہ دو سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ ایک امام ابوالقاسم قشیری جو ابوعلی دقاق کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ ابوالقاسم نصرآبادی کے اور ابوالقاسم نصرآبادی ابوالحسین حضرمی کے صحبت یافتہ تھے۔ ان دونوں نے شبلی کی صحبت پائی اور وہ سید طریقت جنید بغدادی کی صحبت میں بیٹھے۔

علی فارمدی کے دوسرے شیخ خواجہ ابوالقاسم گرگانی ہیں۔ جو ابوعثمان مغربی کی صحبت میں بیٹھے۔ وہ ابوعلی کاتب کے فیض یافتہ تھے اور وہ ابوعلی رودباری کے اور ابوعلی رودباری جنید بغدادی کے۔

سید الطریقت جنید بغدادی نے اپنے ماموں سری سقطی کی صحبت پائی۔ اُنھوں نے معروف کرخی کی۔ اور معروف کرخی بہت سے مشائخ سے فیض یاب ہوئے، جن میں سب سے مشہور ایک تو امام علی بن موسیٰ رضا ہیں، جو اپنے والد امام موسیٰ کاظم کے صحبت یافتہ تھے۔ وہ اپنے والد امام جعفر صادق کے۔ وہ اپنے والد امام محمد باقر کے۔ وہ اپنے والد امام زین العابدین کے۔ وہ اپنے والد امام حسین کے۔ وہ اپنے والد امیر المومنین علی بن ابی طالب کے اور آپ نے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی۔

معروف کرخی کے دوسرے مشہور شیخ داؤد طائی ہیں، جو فضیل اور حبیب عجمی اور ذوالنون کے صحبت یافتہ تھے۔ ان تینوں نے تابعین اور تبع تابعین میں سے بہت سے مشائخ کی صحبت پائی، جن میں سے

سب سے بڑھ کر جلیل القدر حسن بصری ہیں۔ یہ تابعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی صحبت میں بیٹھے۔ ان صحابہ میں سے ایک حضرت انس رضؓ ہیں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آپؐ کی سنت کے حافظ تھے۔ الغرض یہ ہے ہمارے طریقے کا سلسلہ صحبت، جس کی نہ تو صحت میں اور نہ شروع سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کے متصل ہونے میں شک کیا جا سکتا ہے۔ اِس سلسلے میں امام جعفر صادق کو اپنے نانا قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق رضؓ سے بھی انتساب حاصل ہے۔ قاسم نے سلمان فارسی سے فیض پایا۔ اُنھوں نے ابو بکر صدیق رضؓ سے اور ابو بکر صدیق رضؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔

یہ اوپر تو ہمارے طریقے کے ایک سلسلۂ صحبت کا بیان ہوا۔ اِس کے علاوہ ہمارے اَور بھی سلسلے ہیں، جن میں سے کسی میں کہیں کہیں تو صحبت کا اتصال ہے اور کہیں بعیت اور خرقہ کا۔ چنانچہ بندۂ ضعیف نے اپنے والد شیخ عبد الرحیم سے طریقہ لیا۔ انھوں نے شیخ عبد اللہ سے۔ انھوں نے شیخ آدم سے۔ انھوں نے شیخ احمد سرہندی سے۔ انھوں نے اپنے والد شیخ عبد الاحد سے۔ اور انھوں نے شاہ کمال سے۔

شیخ احمد سرہندی کو شیخ سکندر سے بھی طریقہ ملا۔ اُن کو اپنے دادا شاہ کمال سے جن کا ابھی ذکر ہوا۔ اُن کو سید فضیل سے۔ اُن کو سید گدا رحمٰن سے۔ اُن کو سید شمس الدین عارف سے۔ اُن کو سید گدا رحمٰن ابن ابی الحسن سے۔ ان کو شمس الدین صحرائی سے۔ ان کو سید عقیل سے۔ ان کو سید بہاء الدین سے۔ ان کو سید عبد الوہاب سے۔ اُن کو سید شرف الدین قتال سے۔ ان کو سید عبد الرزاق سے۔ اُن کو اپنے والد امام

طریقہ قادریہ ابو محمد عبد القادر جیلانی سے۔ ان کو ابو سعید مخزمی سے۔ ان کو ابو الحسن قرشی سے۔ ان کو ابو الفرج طرطوسی سے۔ ان کو ابو الفضل عبد الواحد تمیمی سے۔ ان کو اپنے والد شیخ عبد العزیز تمیمی سے۔ ان کو ابو بکر شبلی سے اور ابو بکر شبلی کو اس سلسلے کے ذریعہ جو اوپر بیان ہوا، جنید بغدادی سے۔ اسی طرح اُن کو سلسلہ بسلسلہ آخر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ طریقہ ملا۔

اس کے علاوہ شیخ عبد الرحیم نے اپنے نانا شیخ رفیع الدین محمد کی روح سے بھی فیض پایا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ کی پیدائش سے ایک عرصہ پہلے شیخ رفیع الدین نے آپ کو مسندِ طریقت بطور خرقِ عادت عطا فرمائی۔ شیخ رفیع الدین نے اپنے والد شیخ نجم الحق چاپلدہ سے، اور انھوں نے شیخ عبد العزیز سے یہ فیض پایا۔

مزید برآں شیخ عبد الرحیم کے اور بھی سلسلے ہیں۔ آپ کو سید عظمت اللہ اکبر آبادی نے سندِ طریقت مرحمت فرمائی۔ ان کو اپنے باپ داوں سے فیض ملا۔ ان کو شیخ عبد العزیز سے۔ ان کو قاضی خان یوسف ناصحی سے۔ ان کو حسن بن طاہر سے۔ ان کو سید راجی حامد شاہ سے۔ ان کو شیخ حسام الدین مانک پوری سے۔ ان کو خواجہ نور قطب عالم سے۔ ان کو اپنے والد علاؤ الحق بن اسعد لاہوری ثم بنگالی سے۔ اُن کو اخی سراج عثمان اودھی سے، ان کو شیخ نظام الدین اولیا سے۔ ان کو شیخ فرید الدین گنج شکر سے۔ اُن کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے۔ ان کو خواجہ معین الدین سجزی سے۔ ان کو خواجہ عثمان ہارونی سے۔ ان کو حاجی شریف زندنی سے۔ ان کو خواجہ مودود چشتی سے۔ ان کو اپنے والد خواجہ یوسف بن محمد بن سمعان چشتی سے، ان کو اپنے ماموں خواجہ محمد چشتی سے۔ ان کو اپنے والد خواجہ ابو احمد چشتی سے۔ ان کو خواجہ ابو اسحاق شامی سے۔ ان کو ممشاد علو دنیوری سے، ان کو ابو ہبیرہ بصری سے۔ ان کو حذیفہ مرعشی سے۔ ان کو ابراہیم ابن ادہم سے۔ ان کو فضیل بن عیاض سے۔ ان کو عبد الواحد بن زید سے، ان کو حسن بصری سے یہ فیض ملا۔ ان کو علیؓ سے۔ اور ان کو سید المرسلین صلعم سے۔

والدِ بزرگوار نے بطریقہ باطن رسول اللہ صلعم سے بھی فیض حاصل کیا۔ اور وہ اس طرح کہ والد بزرگوار نے رسول اللہ صلعم کو خواب میں دیکھا۔ آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اور رسول اللہ صلعم نے موصوف کو نفی و اثبات کے ذکر کی تلقین فرمائی۔ نیز والد بزرگوار نے حضرت زکریا علیہ السلام سے فیض پایا۔ اور آپؑ نے والد کو اسم ذات کی تعلیم دی۔ اس کے علاوہ والد بزرگوار نے شیخ ابو محمد عبد القادر جیلانی، خواجہ بہاؤ الدین محمد نقشبند اور خواجہ معین الدین ابن حسن چشتی کی ارواح سے بھی کسب فیض کیا۔ والد نے ان ائمہ کو خواب میں دیکھا۔ اور ان سے طریقت کی اجازت حاصل کی۔ نیز آپ نے ان میں سے ہر ایک کی طریقت میں جو نسبت ہے اس کو علیحدہ علیحدہ جانا۔ اور ان ائمہ کی نسبتوں سے آپ کے قلب پر فیضان بھی ہوا۔ چنانچہ والد بزرگوار ہم سے ان چیزوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔

باقی رہا علوم ظاہری کی تحصیل کا معاملہ۔ سو میں نے تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، نحو، صرف، کلام، اصول اور منطق وغیرہ علوم کو اپنے والد سے پڑھا۔ انہوں نے ان علوم کی چھوٹی کتابیں تو اپنے بھائی ابو الرضا محمد سے پڑھیں۔ اور بڑی کتابیں امیر زاہد ہروی سے جو مشہور حواشی کے مصنف ہیں۔ امیر زاہد ہروی نے میرزا فاضل سے۔ انہوں نے ملّا یوسف کوسنج سے۔ انہوں نے مرزا جان وغیرہ سے۔ انہوں نے مشہور محقق جلال الدین دوانی سے۔ انہوں نے اپنے والد اسعد وغیرہ سے۔ اور انہوں نے علامہ تفتازانی اور علامہ شریف جرجانی کے شاگردوں سے۔

حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، صحیح بخاری اور صحاح ستہ کی دوسری کتابوں کی اجازت ثقہ اور مستند عالم حاجی محمد فضل نے مجھے عطا فرمائی۔ انہوں نے شیخ عبد الواحد سے یہ اجازت لی تھی۔ انہوں نے اپنے والد شیخ محمد سعید سے۔ اور انہوں نے اپنے دادا شیخ طریقہ مجددیہ شیخ احمد سرہندی سے یہ اجازت لی تھی۔ اس سلسلے کی ایک طویل سند ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔

الغرض یہ آخری بات ہے، جس پر ہم اس رسالے کو ختم کرتے ہیں۔ والحمد للہ اوّلاً و آخراً و ظاہراً و باطناً۔
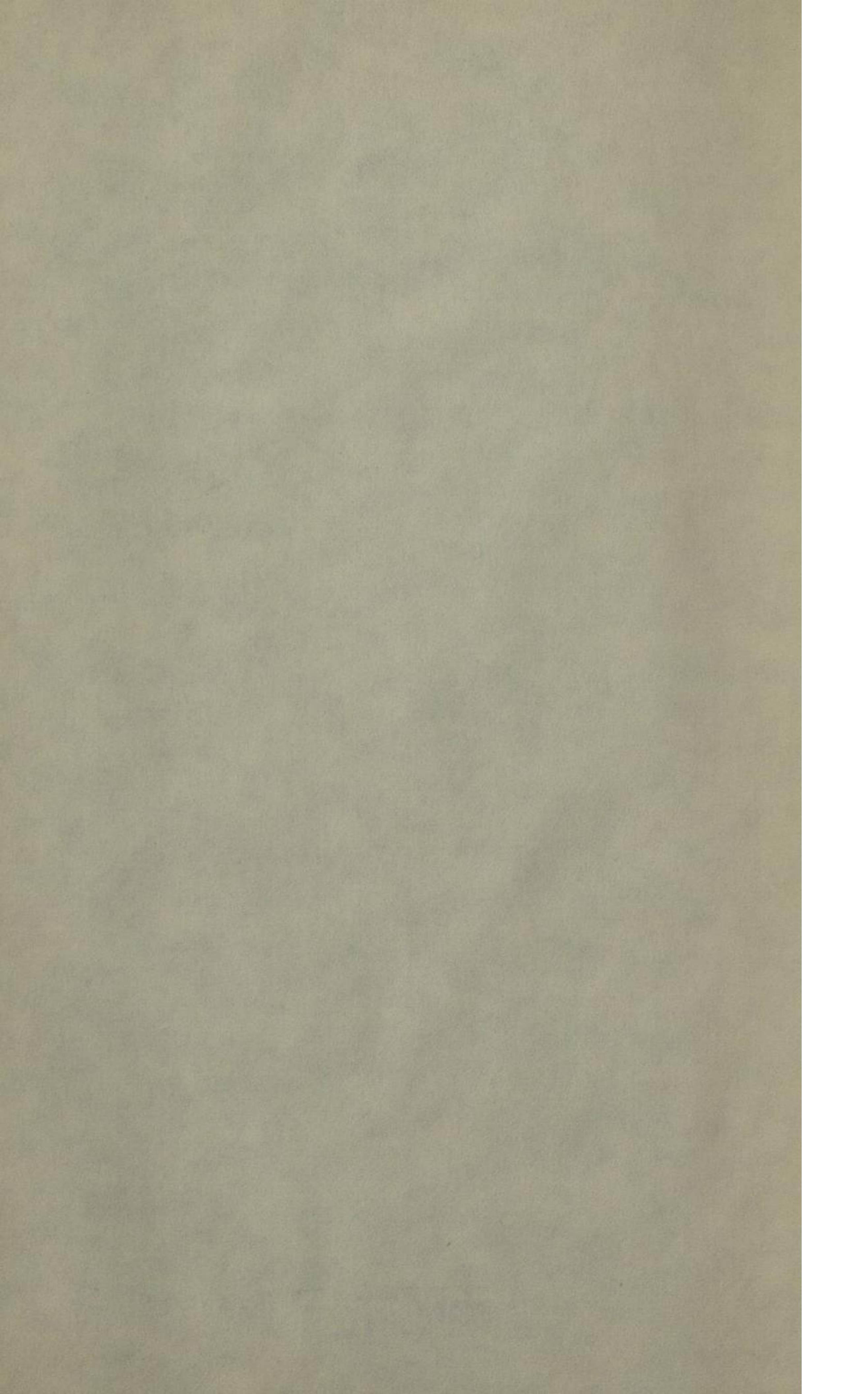
شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا یہ اہم ترین باب ہے - اس میں وہ سب کچھ ہے جس کے نہ جاننے سے آج مسلمان پریشان و سرگرداں ہیں - یہ تصنیف ایک سرچشمہ ہے ان حقائق اور معلومات کا جن سے بڑے سے بڑے اہل علم تک واقف نہیں - یہ کتاب ایک عبرت بھی ہے اور آئندہ کے لئے شمع راہ بھی -

☆

شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ

حضرت مولانا عبیداللہ سندھی

حضرت شاہ ولی اللہ نے تفسیر، حدیث، تصوف اور حکمت و فلسفہ پر بڑی نادر اور بے مثال کتابیں لکھی ہیں - جن کی دنیائے اسلام میں شاید ہی کہیں نظیر مل سکے - مولانا عبیداللہ سندھی نے اس کتاب میں شاہ صاحب کے ان معارف کا ایک مختصر سا خاکہ پیش فرمایا ہے -